ہندستانی ادب کے معمار

شوق نیموی

احمد صغیر

ساہتیہ اکادمی

Shauq Neemvi : A monograph in Urdu by Ahmad Sagheer on the Urdu poet. Sahitya Akademi, New Delhi (2022), Rs. 50.

© Sahitya Akademi

Ahmad Sagheer (1963) : Author

Genre : Monograph

Publisher : Sahitya Akademi

First Edition : 2022

ISBN : 978-93-5548-299-0

Price : ₹ 50

©ساہتیہ اکادمی

احمد صغیر(1963): مصنف

صنف: مونوگراف

پبلشر: ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن: 2022

ISBN : 978-93-5548-299-0

قیمت: 50روپے

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110001

secretary@sahitya-akademi.gov.in | 011-23386626/27/28

سیلس آفس: 'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی 110001

sales@sahitya-akademi.gov.in | 011-23745297, 23364204

کولکاتا: 4ڈی ایل خاں روڈ، کولکاتا 700025

rs.rok@sahitya-akademi.gov.in | 033-24191683, 24191706

چینئی: مین بلڈنگ، گونا بلڈنگس (دوسری منزل)، 443(304)، انا سلائی، تینم پیٹ، چینئی 600018

chennaioffice@sahitya-akademi.gov.in | 044-24311741

ممبئی: 172، ممبئی مراٹھی سنگھر الے مارگ، دادر، ممبئی 400014

rs.rom@sahitya-akademi.gov.in | 022-24135744, 24131948

بنگلور: سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001

rs.rob@sahitya-akademi.gov.in | 080-22245152, 22130870

طابع: سائی بلیسنگ پریس، برہم پوری، دہلی 110053

ویب سائٹ: http://www.sahitya-akademi.gov.in

فہرست

پیش آہنگ	7
احوال و آثار	11
شوق نیموی کی نثری تصانیف	26
شوق نیموی کی شعری نگارشات	40
شوق نیموی کی رباعیات	57
شوق نیموی کے قصیدے	60
شوق نیموی کے قطعات	66
شوق نیموی کی مذہبی تصنیفات	69
ماحصل	74
کتابیات	83

دوستو! ذرا غفلت کا پردہ دل سے اٹھا کر غور سے اس عالم کے انقلاب پر نظر کرو کہ زمانہ کیسے کیسے پلٹے کھایا کرتا ہے اور کیا کیا نیرنگیاں دکھایا کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا کہ حضرت آدم اپنی پیاری بیوی حوا کے ساتھ باغِ بہشت کی بہار لوٹا کرتے تھے اور ایک دن وہ آیا کہ اس روح افزا باغ سے اس خارستان دنیا میں اتار دیے گئے اور طرح طرح کے الجھاؤ میں پڑے۔ شدّاد نے کس دعوے کے ساتھ چاندی اور سونے کی اینٹوں کا بہشت بنایا، کیسے کیسے خوشنما درخت لگائے، نقش و نگار میں کیا کیا صناعیاں کیں۔ مگر اس حسرت کے ساتھ اس جہاں سے اٹھ گیا کہ ایک نظر بھی اپنے دلکش بہشت کو نہ دیکھ سکا۔ نمرود جس نے حضرت ابراہیم کو اٹھا کر آگ کے انبار میں پھینک دیا تھا، تکبر سے جس کا دماغ آسمان پر رہا کرتا تھا اس کو ایک ناچیز مچھر نے کس ذلت کے ساتھ ہلاک کر دیا۔ فرعون جو خدائی کا دعویٰ کیا کرتا تھا اِنَا ربُّکُم الاعلیٰ کا دم بھرا کرتا تھا آخر کس بے بسی سے دریائے نیل میں ڈبویا گیا۔ سکندر جو نامی بادشاہ تھا بڑے بڑے سلاطین اس کے خراج گزار نے عقل سے وہ نایاب چیزیں بنائیں جو قیامت تک یادگار رہیں گی۔ مرنے کے بعد اس کی قبر کا بھی پتہ نہیں کہ کہاں ہے:

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

— شوق نیموی

پیش آہنگ

علامہ شوق نیموی کا شمار بلند پایہ شاعر، محقق اور دبستان عظیم آباد کے معتبر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ علم وادب کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شوق نیموی کی حیثیت ملکی نہیں بین الاقوامی ہے۔ انھوں نے اپنے علمی ادبی کارناموں سے اپنے معاصرین کو متاثر کیا اور انفرادیت قائم کی۔

شوق نیموی 1860 میں صالح پور پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کرنے کے بعد غازی پور اور لکھنؤ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے۔ غازی پور میں مولانا محمد فصیح جیسے عالم وصوفی کی صحبت میں رہے اور ان سے بیعت کی۔ ان کا زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں گزرتا اور علما کی صحبتوں اور مجلسوں میں بھی شریک ہوتے۔

شوق نیموی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ وہ بچپن سے ہی اشعار موزوں کر لیتے اور کبھی کبھی فی البدیہہ اشعار کہہ کر لوگوں کو سناتے۔ سننے والے سمجھتے کہ کسی استاد کا شعر ہے۔ اردو، فارسی اور عربی کے سینکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ ان کی پہلی غزل کا مطلع ہے:

سوزغم سے آبلہ اپنا تفقیدہ ہے
اور سارا جسم شکل موئے آتش دیدہ ہے

اور اسی غزل کا مقطع ہے:

کر تجسس گوہر مقصود مل جائیں گے شوق
دل کے ویرانے میں گنج معرفت پوشیدہ ہے

غازی پور میں قیام کے دوران ہی تسلیم لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ غازی پور میں کئی سال گزارنے کے بعد لکھنؤ پہنچے وہاں جید عالم دین اور محدث مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ درسی کتابوں کے علاوہ شعر و ادب کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ تعلیم مکمل کر کے نیمی واپس آ گئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوق نیموی تصنیف و تالیف میں اپنا وقت گزارنے لگے اور نہ صرف شاعری میں اپنا نام روشن کیا بلکہ حدیث، فقہ اور عروض پر بھی کتابیں لکھ کر مشہور ہوئے۔

شوق نیموی نے سخت محنت اور وسیع مطالعہ کی بدولت شاعری اور نثر میں جو مقام بنایا ہے وہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ شوق نیموی کی تحقیق و تنقید اعلیٰ درجہ کی ہے نیز شعر و سخن کا عمدہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ جب وہ مشاعروں میں شعر پڑھتے تو استاد شعرا بھی داد دیے بغیر نہ رہتے۔ شوق نیموی کو عربی فارسی اور اردو پر دسترس حاصل تھی۔

شوق نیموی کو ابتدائی دور سے ہی مطالعہ کا شوق تھا۔ یہ شوق آخری وقت تک قائم رہا۔ لکھنؤ سے لے کر پٹنہ میں اپنے قیام کے دوران کئی کتابیں لکھیں جو اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔

شوق نیموی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ایک عہد کو متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے وقت کے علما پر بھی اثر ڈالا اور بعد کے علما بھی ان کی تحریروں سے فیض یاب ہوئے۔ وہ اپنی ذات اور کردار سے نہ صرف اپنے اساتذہ کو متاثر کیا بلکہ اپنے ہم عصر ادبا و شعرا کو بھی متاثر کیا۔

شوق نیموی اپنے عہد کے شعرا سے مختلف تھے اور بنی بنائی لکیر پر چلنے کے قائل نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی:

خیال میں نہ پھر آیا جو نکلی روح قالب سے
رہا ہو کر نہ دیکھا خواب بھی یوسف نے زنداں کا

شوق نیموی کسی علم، عقیدے یا تصورات کی تقلید کرنے کے بجائے خود تحقیق و تفتیش اور مطالعے و مباحثے کے ذریعہ مسائل حل کرنے کے قائل رہے۔ شوق نیموی نے مذہبی دنیا اور ادبی دنیا دونوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کی تحریریں آج بھی دعوت فکر دے رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے تئیں علم داں بننے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا بلکہ تحقیق و جستجو کے ذریعہ حقیقت کو آشکار کیا۔ سچ کو سچ کہا اور جھوٹ سے پردہ اٹھانے کی حتی الامکان کوشش کی جس میں وہ

کامیاب ہوئے۔ چاہے ان کا رسالہ 'ازاحۃ الاغلاط' ہو یا 'اصلاح' یا 'سرمۂ تحقیق' ان تینوں رسالوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں تحقیقی شعور کارفرما ہے۔ وہ عربی و فارسی کے ایسے الفاظ کی تحقیق نہایت چھان بین کر کے کی ہے جسے اردو داں طبقہ غلط بولتا رہا ہے یا ان کے غلط معنی اخذ کرتا رہا ہے۔ ان تمام الفاظ کو تحقیق کی روشنی میں پرکھا اور بتایا کہ ان الفاظ کو کیسے بولنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ فن پارے کی ہیئت کے مطالعہ کے بغیر معنی تک رسائی ممکن نہیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب متن کی صحیح معلومات ہو۔

شوق نیموی نے ادبی تنقیدی مضامین کی پیش کش میں ندرت پیدا کیا اور اس کے رخ کو صحیح سمت دکھائی۔ وہ تحقیقی اور مذہبی مضامین میں بھی تقلیدی راہ سے ہٹ کر تحقیق کرتے رہے۔ زبان کا صحیح استعمال سکھایا جس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

شوق نیموی کا خاندان مہذب اور تعلیم یافتہ تھا جس کا اثر ان پر پڑنا لازمی تھا۔ لہٰذا غازی پور اور لکھنؤ میں رہ کر اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے اس تجربے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ادبی دنیا اور مذہبی دنیا میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ زمانہ چاہ کر بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آج بھی شوق نیموی کی نگارشات دعوت فکر دے رہی ہیں۔

شوق نیموی کی تصنیف کردہ کتابیں اہل علم و ادب کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

علامہ شوق نیموی پر مواد اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس کے باوجود میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کوئی پہلو نہ چھوٹے یا ادھورا رہ جائے۔ میں نے ان کی حالاتِ زندگی اور تحریروں کا بھرپور جائزہ لیا ہے تاکہ آئندہ شوق نیموی پر کام کرنے والوں کو آسانی ہو۔

اس مونوگراف کو لکھنے میں مجھے بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو شوق نیموی کی کئی مثنویاں دستیاب نہ ہوسکیں۔ ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن نے 'علامہ شوق نیموی حیات و خدمات' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جو مشکل سے دستیاب ہوسکی۔ اس کے علاوہ ان کے فکر و فن پر ایک دو مضامین ہی رسائل میں شائع ہوئے۔ مونوگراف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اُمید ہے شوق نیموی کے فکر و فن کو سمجھنے میں یہ مونوگراف معاون ثابت ہوگا۔

احمد صغیر

احوال وآثار

شوق نیموی 1860 صالح پور، ضلع پٹنہ میں اپنی خالہ کے گھر پیدا ہوئے۔ والد نے محمد ظہیر احسن نام رکھا۔ ابوالخیر کنیت اور ظہیرالاسلام تاریخی نام قرار پایا۔ شوق نیموی ایک رباعی میں اپنی پیدائش کے بارے میں فرماتے ہیں:

''شوق است تخلصم ظہیر احسن نام
در قریہ دلنواز نیمی است مقام
شد از پئے کنیتم ابوالخیر الہام
تاریخ تولدم ظہیر الاسلام

(1278ھ)

شوق نیموی کا خاندان نیمی کا رہنے والا تھا۔ نیمی کا تعارف شوق نیموی نے اس طرح کرایا ہے:

''میری پیاری بستی جس کا نام نیمی بروزن دہلی بکسر نون وسکون ہے یا معروف و کسریم ہے۔ صوبہ بہار ضلع عظیم آباد، پٹنہ پرگنہ، غیاث پور، تھانہ فتوحہ کے علاقہ میں بارہ گیان میں واقع ہے۔ یہ تو خدا جانے کہ کس صدی میں اس کی بنا ہوئی مگر اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت پرانی بستی ہے جس کو کئی سو برس گزر گئے۔ یہاں اٹھارہ انیس بیگہہ کا ایک بڑا تالاب ہے۔ جس کے ہر چار جانب آبادی ہے۔ اُتر کی طرف شہر خموشاں آباد ہے اور تین طرف بستیاں ہیں۔ پورب والی بستی کو نیمی اور دکھن والی کو مومن پورہ اور پچھم والی کو میاں چک کہتے ہیں۔ یہ دونوں بستیاں جس طرف ظاہر میں بوجہ کمال اتصال نیمی کے ٹولے معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت میں بھی یہ دونوں نیمی ہی کے رقبات سے ہیں۔ میاں چک سے متصل پچھم طرف ایک ٹولہ

تھا جس کا نام چک سید ولی تھا۔ اس میں حضرات سادات رہا کرتے تھے۔ خدا بخشے جب میر ناصر علی اور میر باقر علی اور میر جعفر علی کا زمانہ آیا میر ناصر علی شادی کے بعد اپنی سسرال میں رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد میر باقر علی اور میر جعفر علی میں کچھ ایسا جھگڑا پھیلا کہ میر باقر علی مرحوم تنگ آ کے دوسری جگہ جا بسے۔ چلتے وقت یہ دوہا کہہ گئے تھے:

باقر بھئے بکری اور جعفر بھئے ہونڈار
کہیو بھائی ناصر سے کہ چک بھیا اجاڑ

یہ دوہا سید کی زبان سے نکلا تھا۔ واقعی رفتہ رفتہ اس ٹولے میں جتنے مکان تھے سب کے سب اجڑ گئے جن کا نشان آج تک موجود ہے۔ میاں چک میں کوئی مسلمان نہیں۔ کل لوگ ہندو کی قوم سے ہیں اور من پورہ میں ہندو مسلمان دونوں رہتے ہیں۔ یہ بستی جب اشرف علی خاں کو کہ تخلص بہ فغاں دہلوی کے پوتے فیاض علی خاں مرحوم کے قبضے میں آئی تو انھوں نے اس بستی کا نام من پور سے مومن پورہ بدل دیا۔ اسی زمانے سے اس کے دو نام ہوئے۔ مگر من پورہ زیادہ معروف و مشہور ہے۔ رہی پورب والی آبادی جس کو نیمی کہا کرتے ہیں اور جہاں مؤلف کا گھر ہے وہاں بھی ہندو اور مسلمان دونوں رہتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں شرفا زیادہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہاں جتنے شریف ہیں سب ایک ہی شخص یعنی شیخ شیر محمد بن شیخ عبدالرزاق صدیقی مرحوم کی نسل سے ہے۔ آج نیمی میں کوئی ایسا شریف نہیں جو جناب شیخ مرحوم کی اولاد سے نہ ہو۔'' (یادگار وطن صفحہ 5,7)

شوق نیموی کو اپنے وطن نیمی سے بے حد محبت تھی۔ اس لیے اپنے جذبات کا اظہار اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

بہار اب کی نہ کیوں بھائے کہ ہے میرا وطن نیمی
بنا میں خوشنوا بلبل بنی صحن چمن نیمی

جو کوئی شام غربت کا تھکا ماندہ پہونچتا ہے
دکھاتی ہے بہار جلوہ صبح وطن نیمی

چلو اب سبزہ زاروں سے بہار بوستاں لوٹیں
بنی ہے آج کل برسات میں رشک چمن نیمی

یہی اے شوق میری التجا ہے حضرت حق میں
رہے آباد محشر تک مرا پیارا وطن نیمی

شوق نیموی کے جدّ امجد کا نام شیخ دھومن تھا۔ وہ 1782 میں موضع برڈیہہ میں پیدا ہوئے۔ بی بی میدن سے اُن کا نکاح ہوا جو شیخ اکبر علی نیموی کی صاحبزادی تھیں۔ شیخ دھومن کے چار لڑکے تھے۔ شیخ سبحان علی، شیخ شجاعت علی، شیخ سعادت علی، شیخ سخاوت علی۔ ان میں سب سے بڑے شیخ سبحان علی تھے جو علامہ شوق نیموی کے والد محترم تھے۔

شیخ سبحان علی 1806 میں نیمی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت نیمی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو مولانا محمد فصیح غازی پور جیسے عالم وصوفی کی صحبت سے فیضاب ہوئے اوران سے بیعت بھی ہوئے۔ ان کا زیادہ تر وقت دینی کتابوں کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اُس وقت کے مشہور عالم دین مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی سے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا بھی بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے پاس جمع کرتے یا دوسرے سے لکھوا کر محفوظ کر لیتے۔ شیخ سبحان علی نے 'شاہنامہ فردوسی' (جلد سوم)، 'دیوان حافظ'، 'قصہ حاتم طائی' اور 'دیوان جوشش' جیسی اہم کتابیں انھوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کی تھیں جو شوق نیموی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان کے اس کارنامے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو علم سے کس قدر رغبت تھی۔ شیخ سبحان علی 1878 میں لقوہ کا شکار ہوئے اور اسی بیماری سے اُن کی موت ہوگئی۔ اُن کے انتقال پر شوق نیموی نے کئی قطعات کہے۔

شوق نیموی کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''محمد ظہیر احسن بن سبحان علی بن شیخ دھومن بن شیخ فتح علی بن شیخ محمد وزیر بن شیخ محمد ولی بن شیخ غلام بدر بن شیخ عبدالہادی بن شیخ نصیر بن شیخ محمد صالح بن شیخ ضیاء اللہ بن شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالرحمان بن شیخ عبداللہ بن شیخ نوراللہ بن شیخ حضرت محمد زاہد قدس سرہ بن شیخ محمد عابد صدیقی بن شیخ اسماعیل بن شیخ ابراہیم بن عبدالاسلام بن عبدالغفار بن عبدالرزاق بن عبدالعزیز بن عبدالحمید بن جعفر بن یحیٰ بن عبداللہ بن عیسیٰ خلیل بن عاصم بن قاسم بن علی بن عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ۔''

تعلیم و تربیت

شوق نیموی کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ جب وہ چھ برس کے ہوئے تو مکتب میں داخلہ کرایا گیا۔ وہ بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے۔ اس لیے تمام اساتذہ ان سے محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔

فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے پٹنہ پہنچے اور شمس العلما مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت سے فیضیاب ہوئے۔ حسرت عظیم آبادی نے ان کی ذہانت کو دیکھ کر کافی حوصلہ افزائی کی اور اپنے ہونہار شاگردوں میں شمار کیا۔ شوق نیموی کئی سال تک ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس درمیان انھوں نے کئی کتابیں حسرت عظیم آبادی سے پڑھیں اور کچھ کتابیں دوسرے اساتذہ سے بھی۔ اس کے بعد غازی پور چلے گئے۔ جہاں مولانا مفتی محمد فرنگی محلی نے مدرسہ چشمۂ رحمت قائم کیا تھا اور پورے ملک میں ان کی علم فضل کا شہرہ تھا۔ شوق نیموی نے ان کے یہاں چار دن تک قیام کیا پھر ان کی ہدایت پر مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ اتفاق سے اُس زمانے میں ملک کے دو معروف عالم اس مدرسے میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک مولانا حافظ عبداللہ اور دوسرے مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی۔ شوق نیموی ان تینوں اساتذہ سے فیضیاب ہوئے۔

شاعری کی ابتدا

شوق نیموی کم عمری سے ہی شعر موزوں کر لیتے تھے اور کبھی کبھی فی البدیہہ اشعار کہہ کر لوگوں کو سنا دیتے تھے۔ اُردو، فارسی اور عربی کے سینکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ بیت بازی کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے بیت بازی کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بیت بازی میں حصہ لینے کی وجہ سے ہی دوسرے شاعروں کے اشعار بھی انھیں یاد تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''لڑکپن ہی میں خدا نے طبیعت ایسی موزوں بنائی تھی کہ جب میں گلستان ہی پڑھتا تھا تو فی البدیہہ شعر موزوں کر لیتا تھا۔ ان میں غلطیاں تو ضرور ہوں گی مگر ایسی نہ تھیں کہ غیر شاعر کوئی تمیز کر سکتا۔

والد مرحوم نے بیت بازی کے لیے بہ ترتیب حرف تہجی اساتذہ کے بہت سے اشعار جمع کر دیے تھے، جن کے آخر میں رائے مہملہ تھی اور وہ اشعار مجھے یاد کرا دیے تھے۔ میں جب کسی برات کے ساتھ کسی غیر بستی میں جاتا اور وہاں کے لڑکے بیت بازی کے لیے پہنچتے اور بیت بازیاں شروع ہوتیں تو میں وہی رائے مہملہ والے اشعار پڑھتا جن کے جواب میں ان کا قافیہ تنگ ہو جاتا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ حریف کو بھی کسی خاص حرف کے اشعار بہت یاد تھے جن سے مجھ کو دقت پڑتی مگر جب استاد کا کوئی شعر یاد نہیں آتا تو نظم کر کے جواب دے دیتا۔ ان بیچاروں کو وہم تک نہ ہوتا کہ یہ شعر اس کا طبع زاد ہے۔ کہاں تک جواب دیتے۔ آخر مات کھا جاتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بیت بازی کے معرکے میں کبھی بھی کسی سے مات نہیں ہوا۔''

غازی پور میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا، جس کی طرح یہ تھی:

جامۂ ہستی میرے تن پر بہت بوسیدہ ہے

شوق نیموی نے اسی زمین میں ایک غزل کہی۔ جس کا مطلع ہے:

سوز غم سے آبلہ اپنا دل تنقیدہ ہے
اور سارا جسم شکل موئے آتش دیدہ ہے

جب یہ غزل مشاعرے میں پڑھی گئی تو سامعین نے بے حد پسند کیا۔ محمد شفیع موج نے شوق نیموی کو شمشاد لکھنوی سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔ وہ یہ غزل لے کر استاد محترم کی خدمت میں پیش ہوئے۔ شمشاد لکھنوی نے غزل دیکھی اور اسی دن سے وہ شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔

شوق نیموی جن دنوں غازی پور میں مقیم تھے۔ نامور اساتذہ کی محبت اور علمی و ادبی ماحول نے ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھایا۔ بالخصوص شمشاد لکھنوی کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اُردو، فارسی اور عربی کی جو کتابیں ان کے ہاتھ لگ جاتیں اُن کو ختم کیے بغیر نہیں رہتے۔ مطالعے کے بعد جو وقت بچتا وہ شعر کہنے میں لگاتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پھر یہ حالت رہی کہ کتب عربیہ کے درس و تدریس سے جب کچھ مہلت ملتی تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتا۔ ہفتے میں ایک آدھ غزل ضرور کہتا اور اصلاح لیتا۔

حضرت استاد جو کچھ ارشاد فرماتے محفوظ کر لیتا اور فن شاعری کے متعلق جو کتاب نظر سے گزرتی اُس کا بالاستیعاب دیکھ جاتا۔ اس زمانے میں جس قدر میں نے محنت کی ہے میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور لطف یہ کہ حضرت شمشاد سے میں نے فارسی بھی شروع کر دی۔ سہ نثر ظہوری، قصائد عرفی، قصائد خاقانی، حدائق البلاغت ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ غرض کہ عربی و فارسی کی تحصیل میں نظم و نثر اُردو کی مشق میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اکثر بارہ بجے رات تک اور کبھی دو ایک بجے تک کتابیں دیکھا کرتا۔"

شوق نیموی کی حوصلہ افزائی ہونے لگی تو اُن کا حوصلہ کافی بلند ہو گیا۔ ایک طرحی مشاعرے میں اپنی دوسری غزل پڑھی۔ جس کا مطلع ہے:

وہ پردہ نشیں جلوہ گر خانہ دل تھا
آباد کبھی گوشۂ ویرانہ دل تھا

کافی دنوں تک غازی پور میں مشاعرہ نہ ہوا تو انھوں نے خود مشاعرہ منعقد کیا اور طرح دیا "ذرا انصاف او صیاد کرنا"۔ اس مشاعرے میں شوق نیموی نے جو غزل پڑھی وہ کافی مقبول ہوئی۔

شوق نیموی جب لکھنؤ میں تھے۔ وہاں کے مشاعرے میں کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی چار غزلیں اپنے استاد حسرت عظیم آبادی کے پاس اصلاح کے لیے بھیجیں۔ حسرت عظیم آبادی نے غزلیں پسند فرمائیں۔

حسرت عظیم آبادی نے ان غزلوں کو پڑھنے کے بعد ایک خط شوق نیموی کو لکھا۔ وہ خط فارسی زبان میں ہے لیکن یہاں ترجمہ پیش خدمت ہے:

"سلام و دعا کے بعد واضح ہو کہ آپ کا نامۂ محبت طراز جو دل کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ خوبصورت اور دلکش غزلوں کے ساتھ بتاریخ چار ربیع الاخیر بروز شنبہ موصول ہوا۔ اس نے آنکھوں کو روشنی اور دل کو سرمہ بخشا۔ آپ کی خوبصورت اور شیریں کلام کو پڑھ کر جو تاثر قائم ہوا وہ شرح و بیان سے خارج اور تقریر و تحریر کے احاطے سے باہر ہے۔ میں گرچہ اردو شاعری کے کوچے سے نابلد ہوں، تاہم اتنا

ضرور کہہ سکتا ہوں کہ لطف زبان، ادا بندی، نازک خیالی ان اشعار میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ آفریں ہو اس خداداد صاحب استعداد، تیز طبع، ذہن نقاد پر کہ اس نے اس کم عمری میں مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی۔ آپ نے میرے دیوان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی محبت کا تقاضہ ہے۔ میری آرزو ہے کہ یہ دیوان از اوّل تا آخر آپ کی نظر سے گزر جائے۔ افسوس جان سخن گر پر کہ وہ سخن داں تک نہ پہنچے۔ میں نے یہ خط کمال شفقت سے جو آپ کے ساتھ ہے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔''

شوق نیموی طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے دوران کئی کتابیں لکھیں۔ 1885 میں ایک مثنوی لکھی جس کا تاریخی نام 'نغمۂ راز' ہے۔ اس کے علاوہ 'ازاحتہ الاغلاط' اور 'اصلاح' نام سے دو کتابیں تصنیف کیں جو عربی و فارسی الفاظ کی تحقیق اور اُردو زبان و بیان کی درستگی کے لیے کارآمد ہے۔ یہ کتابیں جب منظر عام پر آئیں تو اہل علم نے کافی تعریف کی لیکن جلال لکھنوی جیسے شاعر نے ان پر سخت تنقیدیں لکھیں۔ جن کی بنا پر جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے درمیان ادبی معرکہ چھڑ گیا۔

شوق نیموی نواب رامپور کلب علی خاں سے ملنے رامپور گئے۔ نواب صاحب نے اپنے دربار میں ان کی خاطر و مدارات کی۔ شوق نیموی ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ایک قصیدہ بعنوان 'نواب رامپور کلب علی خاں کی شان میں' پیش کیا۔

نواب رامپور یہ قصیدہ سن کر بے حد متاثر ہوئے اور معقول نقد رقم سے نوازا اور سال میں دو ایک بار رامپور آنے کی دعوت دی۔ اُس وقت داغ دہلوی بھی دربار میں موجود تھے۔ انھوں نے بھی یہ قصیدہ سنا اور نہایت تعریف کی۔ شوق نیموی اس کے بعد کبھی بھی رامپور نہیں گئے۔

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ آئے۔

جلال لکھنوی نے تصنیف 'ازاحتہ الاغلاط' کے جواب میں ایک رسالہ لکھا جو 'تردید' کے نام سے شائع ہوا۔ شوق نیموی نے 'تردید' کے جواب میں 'سرمۂ تحقیق' لکھا۔ یہ رسالہ تحقیق و تنقید کے لحاظ سے بے حد مفید ہے۔ اس رسالے کو پڑھ کر جلال لکھنوی لاجواب ہو گئے اور آگے اس پر گفتگو بند کر دی۔

شوق نیموی نیمی میں کچھ دنوں تک رہنے کے بعد پٹنہ آ گئے اور محلہ سلطان گنج میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ ذریعہ معاش کے طور پر طبابت شروع کر دی لیکن ان کا ذوق علمی، دینی اور ادبی تھا۔ اس لیے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں اپنا زیادہ وقت گزارتے۔ وہ بالخصوص قرآن، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی شوق ان کو محنت سے پڑھانے پر مجبور کرتے تھے۔

شادی

شوق نیموی غازی پور میں زیر تعلیم تھے کہ ان کی شادی مقرر ہوگئی۔ 1882 میں ان کے خالو شیخ بشارت علی کی بڑی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا جن کا نام مخدومن تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے حسرت عظیم آبادی نے درج ذیل قطعہ تاریخ کہا:

مشفقی مولوی ظہیر احسن　　کتخدا گشت چوں بفصل خدا
سال تاریخ شد بروے جمیل　　ازدواج ظہیر احسن ما

دوسری شادی ان کی چچازاد بہن سے ہوئی تھی جو بیوہ ہو چکی تھیں۔

اولاد

شوق نیموی کی پہلی بیوی سے دو اولادیں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ دوسرے مولانا عبدالرشید فوقانی۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکا عبدالسلام پیدا ہوا جو زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

عبدالرشید فوقانی سادہ مزاج اور متواضع طبیعت کے تھے۔ معمولی کھانا، معمولی کپڑا اور فرش پر سوتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا۔ کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ انھوں نے تقریباً گیارہ کتابیں لکھی ہیں جو حدیث، فقہ اور عروض کے موضوع پر ہیں۔ ان کی چند کتابیں درج ذیل ہیں: ''القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن (عربی)، ضمیمہ وسیلۃ العقبیٰ (اردو)، تذکار الشوق (اردو)، نسب نامہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (اردو)، رباعی نامہ (اردو)

تعقبات فوقانی (اردو)۔

عبدالرشید فوقانی نثر کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور فوقانی تخلص کرتے تھے۔ 'نالۂ فوقانی' اور 'افکار فوقانی' ان کی منظوم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ القول الحسن مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ کے آخر میں انھوں نے اپنی چار نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان کی وفات اپریل 1971 میں پٹنہ میں ہوئی۔

شوق نیموی کا جھکاؤ جہاں ادب کی طرف تھا وہیں مذہب کی طرف بھی تھا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اُردو میں جو کتابیں دستیاب ہیں وہ بے حد اہم ہیں چاہے وہ 'ازاحۃ الاغلاط' ہو 'اصلاح' ہو یا 'سرمہ تحقیق'۔ دو مثنوی 'نغمہ راز' اور 'سوز و گداز' بھی مقبولیت کی حامل ہیں۔ ان دو مثنویوں کی وجہ سے ہی شوق نیموی شہرت کے بام عروج تک پہنچے۔ اس کے علاوہ 'دیوان شوق' کے نام سے ایک شعری مجموعہ ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ ان کتابوں کی بنیاد پر ہم شوق نیموی کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شوق نیموی نے مثنوی 'سوز و گداز' لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی جب مثنوی کا رواج تقریباً ختم ہو رہا تھا لیکن شوق نیموی نے دو پیار کرنے والوں کی تصویر اس مثنوی میں بے حد خوبصورت انداز میں کھینچی ہے۔ 'دیوان شوق' میں جتنی غزلیں ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری عام شاعری نہیں ہے۔

شاگرد

شوق نیموی کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ لیکن چند نام ایسے ہیں جو بے حد مقبول ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ مولانا آزاد نے اوائل عمری میں شوق نیموی کی دو کتابیں 'اصلاح' اور 'ازاحۃ الاغلاط' کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے مداح ہو گئے اور ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے اشعار کی اصلاح لینے لگے اور تا آخر مشق سخن اصلاح لیتے رہے۔ اس کا ذکر 'آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی' میں موجود ہے۔ جس میں مولانا آزاد نے اعتراف کیا ہے کہ وہ شوق نیموی سے اصلاح لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں

''اس زمانے میں ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو میں رسالہ 'اصلاح' اور 'ازاحۃ الاغلاط' لکھنؤ سے منگوایا۔ یہ دونوں رسالے مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے تھے اور فوائدِ متعلقہ، شعرگوئی مبحث متروکات و تصحیح الفاظ میں بہت مفید ہیں۔ ان رسالوں سے ان کی دیگر تصانیف کا حال معلوم ہوا اور پھر پٹنہ سے براہ راست انھیں لکھ کر تمام کتابیں منگوائیں۔ ان میں 'سرمہ تحقیق' اور 'یادگار وطن' بھی تھی۔ اس وقت جیسی طبیعت اور معاملات تھے۔ اس کے لحاظ سے ان حالات کا بہت زیادہ اثر پڑا اور ان کی شاعرانہ واقفیت دل پر نقش ہوگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے ان سے خط و کتابت کی اور اصلاح لینا شروع کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت جی لگا کر اصلاح دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کے ساتھ ایک ایک صفحہ کے فوائد بھی، جن کا کچھ تعلق اشعار زیر اصلاح سے ہوتا تھا، لکھتے تھے۔''

(آزاد کی کہانی، خود ان کی کہانی، ص 149-148)

مرزا محمد رئیس بخت زبیر دہلوی جو آخری مغل بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے شوق نیموی کے شاگرد تھے۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ شوق نیموی جیسے باکمال شاعر کے شاگرد ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے:

حضرت شوق کا ہے فیض زبیر
تجھ میں ایسی جو خوش بیانی ہے

جب سے شوق نیموی سے ہے تلمذ اے زبیر
پایہ کیسا بڑھ گیا تقریر کا تقدیر کا

مرزا علی رضا ضیا عظیم آبادی صوبہ بہار کے ایک شاعر گزرے ہیں جن کی پیدائش 1881 میں ہوئی۔ 19 سال کی عمر میں ایک ردیف وار دیوان ترتیب دیا اور شوق نیموی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کا شعری مجموعہ 'دیوان ضیا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں دو سو غزلیں شامل ہیں۔

ان کے علاوہ شفق عماد پوری (گیا)، اختر (حاجی پور ضلع سلہٹ)، بسمل (چوہٹہ پٹنہ)،

بشیر (بکا کوٹ ضلع بلیا)، تسطیر (پورنیہ)، تفسیر (پورنیہ)، خیر (قاضی بہیڑا دربھنگہ)، راغب (بہار شریف)، شاغل (چوہٹہ پٹنہ)، طالب (ملتان)، عرشی (کرایہ پر سرائے پٹنہ)، کامل (بارہ دری بہار شریف)، کاہش (امتھوا، گیا)، مائل (لودی کٹرہ، پٹنہ)، مذاق (گن پورہ، پٹنہ)، واصل (کنگھیا ٹولہ، پٹنہ)، واقف (بارہ دری، بہار شریف)۔

شوق نیموی ادبا و شعرا کی نظر میں

ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کو ان کی زندگی میں مقبولیت حاصل ہو جائے۔ شوق نیموی ان شاعروں میں ہیں جن کو ان کی زندگی میں ہی ایک اہم شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے اساتذہ نے بھی ان کی تصنیف کو خوب سراہا اور ان کے معاصر شعرا نے بھی ان کی تعریف کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے۔ ان میں سعید حسرت عظیم آبادی، تسلیم لکھنوی، شمشاد لکھنوی، داغ دہلوی، امیر مینائی، عبدالعلی آسی مدراسی، حسن مارہروی وغیرہ یا تو اساتذہ ہیں یا معاصر شعرا ہیں۔

داغ دہلوی نے مثنوی 'سوز و گداز' کو پڑھنے کے بعد اپنے خط میں لکھا:

''ارا یکہ آرائے بزم کمال محقق بے مثال دامِ عنایتکم''

امیر مینائی نے مثنوی 'نغمۂ راز' کی طباعت پر قطعہ تاریخ رقم کیا:

جواہر مضامین کے لاکھوں بھرے ہیں
بلاغت کی کان آج یہ مثنوی ہے
امیر اس کی تاریخ میں نے یہ لکھی
فصاحت کی جان آج یہ مثنوی ہے

شوق نیموی کے استاد محترم تسلیم لکھنوی نے اپنے شاگرد کی تعریف اشعار میں اس طرح کی ہے:

بارک اللہ اے ظہیر احسن　　مجمع علم و ماہر ہر فن
مثنوی لکھی کیا نئی تم نے　　ساحری شاعری میں کی تم نے

وہ فصاحت زبان میں رکھی ہے — وہ بلاغت بیان میں رکھی ہے
دل ہی جس کا مزہ اٹھاتا ہے — شعر تحسیں لبوں تک آتا ہے
اوج بخشا کمال کو کیا کیا — دی بلندی خیال کو کیا کیا
سیر نے اک مزہ دیا دل کو — نقش حیرت بنادیا دل کو

بہر تاریخ کلک کی ہے یہ لیے
وہ کیا دل پند نغمہ ہے

شوق نیموی کی عبقری شخصیت اور عالمانہ حیثیت کو انور شاہ کشمیری نے قصیدے میں پیش کیا ہے جو 'آثار السنن' جز و ثانی صفحہ 131 پر درج ہے۔

شوق نیموی اور جلال لکھنوی کا ادبی معرکہ

شوق نیموی جب لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے زمانہ طالب علمی میں ہی 'ازاحتہ الاغلاط' نام کی کتاب لکھی جس میں جلال لکھنوی کی مشہور زمانہ کتاب 'تنقیح اللغات' کے بعض الفاظ کی تحقیقات سے اختلاف کرتے ہوئے تائید میں شعری و ادبی ثبوت وشواہد پیش کیے تھے۔ جلال لکھنوی اس وقت ہندوستان کے مشہور شعرا میں شمار ہوتے تھے، وہ یہ کب گوارہ کرتے کہ کوئی طالب علم ان کی تحقیقات سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کی نشان دہی کرے۔ جلال لکھنوی بے حد ناراض ہوئے اور اس کے جواب میں 'تردید' نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے شاگرد کے نام سے چھپوایا جس میں سطحی انداز میں شوق نیموی کی کتاب 'ازاحتہ الاغلاط' کو نشانہ بنایا گیا۔ شوق نیموی بھی کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ لہٰذا 1887 میں 'تردید' کے جواب میں 'سرمۂ تحقیق' کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں جلال لکھنوی کی دیگر خامیوں کو اجاگر کیا۔ جلال لکھنوی 'سرمۂ تحقیق' کی اشاعت کے بعد مزید برہم ہوئے اور ایک جعلی اشتہار 'گلدستہ نغمہ بہار' فروری 1889 کے شمارہ میں شائع کروایا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ایک قصبہ کا رہنے والا اور وہ بھی عظیم آباد کا رہنے والا شخص جلال لکھنوی جیسے عظیم شاعر کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے بڑی نادانی کی ہے۔ اس اشتہار کا ادبی حلقوں میں بڑا چرچہ ہوا اور

شوق نیموی کی حمایت میں کئی مضامین لکھے گئے جس سے ان کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔'یادگار وطن' میں وہ لکھتے ہیں : جلال والوتم لاکھ لام باندھو۔ ہزار گیدڑ بھپکیاں دو۔ یہاں تیور میلے نہیں ہو سکتے۔تم کو بھگا دینا کچھ ٹیڑھی کھیر نہیں۔معرکہ مار لینا کوئی بات نہیں۔جس دم میرا کلک شیر نیستانی ڈکارتا ہوا ٹوٹ پڑے گا، پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑے گا دھاک بند ہو جائے گا۔رن بول اٹھے گا۔دم بھر میں تم تتر بتر ہو جاؤ گے۔میدان سنسان نظر آنے لگے گا۔تم نے جعلی اشتہار کیوں چھاپا۔طوفان کیوں اُٹھایا۔طومار کیوں باندھا۔تمہاری چھیڑ چھاڑ سے دل پکا پھوڑا ہو رہا ہے۔آنکھوں میں خون اتر آیا ہے جب تک سری ٹیک نہ کرو گے، اس معرکے کا پالا ٹھنڈا نہ ہوگا۔دیکھو اس گھمسان کی لڑائی میں کس کو کلنک کا ٹیکا لگتا ہے اور کس کا بول بالا رہتا ہے۔کون جھنڈے پر چڑھتا ہے اور کون فتح کا ڈنکا بجاتا ہے۔آج حضرت جلال کی غلط بیانی انھیں کے کلام سے ثابت کی جاتی ہے۔ممکن نہیں کہ تم آنکھوں پر دیوار اُٹھاؤ، مجال نہیں کہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔(۱) سرمایہ زبان اردو میں لکھتے ہیں۔"روپیا سکہ اور چاندی کو کہتے ہیں۔جمع اس کی فصحا روپے بولتے ہیں اور یہ جو ہائے مختفی سے روپیہ لکھا جاتا ہے مؤلف ہیچمدان کے عندیے میں غلط ہے۔" غلطی کی وجہ غالباً آپ یہ سمجھے ہیں کہ یہ لفظ ہندی ہے اور الفاظ ہندیہ کے آخر میں ہائے مخفیہ نہیں لکھی جاتی۔تارا، کلیجا۔اس قسم کے الفاظ ہائے مخفیہ سے لکھنا صحیح نہیں۔افسوس اس کا تو خیال کیا مگر اس کی خبر نہیں کہ متاخرین عجم نے استعمال کیا ہے۔ہندی سے مفرس ہو گیا ہے پس بہائے مختفی غلط نہیں۔آپ دو گلشن فیض میں 'چہری روپیہ' کے بارے میں لکھتے ہیں۔بائے فارسی وتحتانی ہر دو مفتوح بہائے مخفیہ سبحان اللہ یہاں تو بہائے مخفیہ درست ٹھہرے اور وہاں غلط قرار پائے۔(۲) سونچنا۔نون غنہ کے ساتھ اندیشدن کا ترجمہ ہے۔لوگ جو اس کو بدون نون غنہ کے پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مؤلف کے نزدیک غلط ہے۔غلط لکھ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔بندہ نواز غلط ہرگز نہیں۔مع نون اور بے نون دونوں طرح صحیح ہے۔اس کا حاصل مصدر 'سوچ لوچ' کے قافیہ میں آ گیا ہے اور آپ خود گلشن فیض میں 'سوجی' کے بعد اور 'سوخت' کے قبل لکھتے ہیں۔'سوچ میں مہملہ واو مجہول وجیم فارسی' جلال والوتم کچھ سمجھے یا نہیں جب سوچ بے نون صحیح ہوا تو سوچنا بے نون کیوں غلط ہونے لگا۔(۳) غلبہ بسکون لام کے

تنقیح میں بہرصورت یعنی اردو میں بھی غلط بتاتے ہیں اور خود ہی دیوان اول صفحہ 215 میں فرماتے ہیں:

طوفان سے بیڑا نوح کا تونے بچا دیا
فرعون پر کلیم کا غلبہ عطا کیا

جب غلبہ بسکون لام غلط ٹھہرا تو یہاں بسکون کیوں باندھا گیا۔حق یہ ہے کہ آپ کی تعلیم ہی غلط ہے اور بسکون لام بھی صحیح ہے۔کماھقہٗ فی الازاحتہ (۴) کار آمد شعرا میں لفظ کے بارے میں بعد چنان وچین لکھتے ہیں "لیکن حق یہ ہے کہ اکثر فصحا کے نزدیک لفظ مذکر ہے اور مؤلف بھی اس کی تذکیر کا ہی قائل ہے۔" جی ہاں آپ ضرور تذکیر کے ہی قائل ہیں۔شاہد شوخ طبع میں آپ نے جو یہ شعر تحریر فرمایا ہے:

کس ترقی پہ ہے حسن سخن اللہ اللہ
شوخ نعظین ہیں دلہن معنیٔ رنگین نوشاہ

اس میں لفظ مذکر بندھا ہے یا مؤنث۔ یے اور نون کے ساتھ مؤنث کی جمع ہوتی ہے یا مذکر کی۔

جلال والوتم نے پوربی دیہاتی شوق نیموی کا کمال دیکھا۔آج کیسی خبر لی۔قلعی کھل گئی۔ ممکن نہیں کہ تم آنکھوں میں دھول ڈال دو۔تل کی اوٹ پہاڑ کچھ تاویل کر کے جان بچاؤ۔آج تمہیں لوہا ماننا پڑے گا اور حضرت جلال کی غلطیوں کا اقرار کرنا ہوگا۔"

('یادگار وطن'، ص 79-77)

اس ادبی معرکہ کے اہم ترین موضوع 'چھان بین' اور 'جگنو وجگنی' کی بحثیں ہیں۔ جلال لکھنوی نے اپنی کتاب 'سرمایہ زبان اردو' میں لکھا تھا کہ اصل محاورہ چھان بنان ہے۔ اہل لکھنؤ اسی طرح بولتے ہیں۔ چھان بین غلط ہے۔شوق نیموی نے اپنی تصنیف میں لکھا کہ چھان بین غلط نہیں صحیح ہے۔ اہل دہلی چھان بین بولتے تھے اور اہل لکھنؤ چھان بنان استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں اکثر فصحا چھان بنان ترک کر کے چھان بین لکھنے لگے۔اس طرح شوق نیموی کی جیت ہوئی۔

’جگنو و جگنی‘ کے بحث میں بھی شوق نیموی نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ایک مضمون 16 اکتوبر 1889 میں لکھا جس میں بتایا کہ:

جناب عالی! جگنی و جگنو دونوں صحیح ہیں۔ رند:

سرکا دو پٹا شب کو جو گردن کے پاس سے
جگنو کی طرح ہار کا جگنو چمک گیا

جب یہ مضمون شائع ہوا تو اخبار ’آزاد‘ لکھنؤ کے مدیر منشی احمد علی شوق جگوری اور دو ایک دوسرے اہل قلم نے اس کے خلاف قلم اٹھایا اور شوق نیموی کو غلط ظاہر کر کے ان پر سخت تنقیدیں کیں اور ان کی تحقیقات کو غلط قرار دیا۔ اب شوق نیموی اور ان کے دوستوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ جلال لکھنوی کے گروپ کا جواب دیں۔ شوق نیموی نے مثال میں کئی اشعار لکھے۔ افسوس کا ایک شعر درج کیا:

شب کو یاد آئے اگر اس کے گلے کا جگنو
جو شرارہ ہے میری آہ کا جگنو ہو جائے

اس طرح شوق نیموی اس معرکہ کے ہیرو بن گئے اور جلال لکھنوی کو منہ کی کھانی پڑی۔

وفات

شوق نیموی کا انتقال 25 نومبر 1904، 17 رمضان المبارک 1322 ہجری کو 44 سال کی عمر میں شاہ کی املی محلہ پٹنہ سیٹی میں ہوا۔ نعش مبارکہ آبائی گاؤں نیمی لے جائی گئی۔ انھیں آبائی قبرستان نیمی میں سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا عبدالعلی آسی نے قطعہ تاریخ کہی ہے:

علامہ سخن نامی دوران زمین بود
1322 ہجری

○

شوق نیموی کی نثری تصانیف

شوق نیموی کا شمار اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ کم عمری سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ جب وہ مدرسہ چشمۂ رحمت، غازی پور میں زیرِ تعلیم تھے اُسی وقت سے شعر موزوں کہنے لگے تھے۔ اُن کی کئی تصنیفات طالب علمی کے زمانے میں ہی منظرعام پر آگئیں تھیں اور آخری وقت تک تخلیق و تنقید میں مصروف رہے۔ یہاں اُن کی تصنیفات کا جائزہ پیش کر رہا ہوں تا کہ اُن کی ادبی اور مذہبی کتابوں کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ازاحتہ الاغلاط

یہ فارسی زبان میں لکھا گیا ایک اہم رسالہ ہے جو 1893 میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ بعدازاں مولانا حسرت موہانی نے اسے اُردو پریس علی گڑھ سے چھاپا۔ اس رسالہ میں عربی وفارسی کے ایسے الفاظ کی چھان بین کی گئی ہے جنھیں اُردو داں اکثر غلط بولتے ہیں یا اُن کے غلط معنی اخذ کرتے ہیں۔ اس رسالہ میں غلط عام اور غلط عوام کی تشریح کی گئی ہے۔ اس رسالہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مؤلف آصف اللغات نے اپنی لغت کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ بڑے سائز میں 39 صفحات پر مشتمل ہے۔
جب یہ رسالہ شائع ہوا تو جلال لکھنوی جیسے معروف شاعر نے اس پر سخت تنقید لکھی جن کی بنا پر دونوں میں ادبی معرکہ چھڑ گیا۔ اس رسالے کی زبان فارسی ہے اور گفتگو کو مدلل بنانے کے لیے فارسی اور عربی کے اہم شعرا کے شعر کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شوق نیموی نے مشہور لغات مثلاً قاموس، مصباح منیر، منتخب اللغات، نفائس اللغات اور برہان قاطع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معیاری تحقیق اور زبان دانی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں کئی جگہوں

پر ماہرین لغات سے بھی اختلاف کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''پوشاک بمعنی لباس بعض اجلۂ عصر در فارسی آں تأمل دارند گویم کہ صاحب بہار عجم نوشتہ پوشاک چیز ہائے پوشیدن۔ طغریٰ در تصانیف خود استعمال کردہ اگر گوئی کہ علامہ طغریٰ عمداً بالفاظ ہندیہ باستعمال می آورد گویم کہ جماعتی از میرانیاں بہ تحقیق می پیوست کہ در پارسی پوشاک بایں معنی مستعمل است۔'' (ازاحتہ الاغلاط، ص9)

لفظ 'آتش' کے متعلق مرزا غالب سے اختلاف کرتے ہوئے علامہ شوق نیموی لکھتے ہیں:

''دیگراں یکسو مرزا غالب کہ در فارسی ید طولیٰ داشت می نگارد کہ قافیہ آتش با دانش او عائیت نا دلپذیر و بعض اجلۂ عصر و دیگراں دریں باب متبعیت میرزا کردہ اند۔ گویم کہ منشائے آں عدم تفحص باشد۔ نظامی گوید:

ہمہ کارشاں شرب و آتش گری

نکشتہ شمی گرد چالش گری

و ملا ہبری خراسانی در قطعہ ایں بیت نوشتہ:

پیوند شکستگی است باعشق

چوں کسرئ حرف تائے آتش''

(ازاحتہ الاغلاط، ص3)

غیاث اللغات کے مؤلف سے اختلاف کرتے ہوئے لفظ زیادتی کے بارے میں اپنا نظریہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''زیادتی در غیاث اللغات نوشتہ کہ بیائی تحتانی زائدہ محاورۂ عوام است گویم کہ در کلام فصحا جابجا در آخر مصادر عربیہ زیادت تحتانی است و ایں ہم ازاں قبیل است۔ مرزا صائب گوید:

برجسم آں قدر کہ فرودیم ہم چو شمع

شد مایۂ زیادتی اشک دہ ماہ ما''

(ازاحتہ الاغلاط، ص16)

مرزا غالب کی تحقیقات کے بارے میں اپنا موقف اس طرح پیش کرتے ہیں:

''مرزا غالب در ملحقات قاطع برہان نوشتہ کہ یارب شیخ را فتادہ بود کہ وچہ گونہ غفلت روی دادہ بود کہ بے ضرورت حرکت لفظ را برگرداند و نظر ثانی نیز نکند تا شعر ہم چناں ماند:

از وعفو کردم عملہائے زشت
بفضل خود ش آورم در بہشت

مگر در تقطیع نمی گنجد من از جانب شیخ سوگند می خورم۔ کہ شیخ نہ آں خیال نگاشتہ است کہ کاتب پنداشتہ است وبہا رروداشتہ است۔ گویم کہ چوں میرزا با محققیں ہند تعصبی داشت ہر چند دلش خواست نگاشت۔'' (ازاحتہ الاغلاط، ص 35)

'ازاحتہ الاغلاط' کئی لحاظ سے ایک اہم تالیف ہے۔ بقول صفیر بلگرامی:

''یہ رسالہ جناب مولوی محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی تالیف کیا ہوا جناب منشی محمد نثار حسین صاحب مہتمم پیام یار کے قومی پریس کا بہت واضح اور خوشخط چھپا ہوا ہم تک بھی پہنچا۔ یہ رسالہ صحت اغلاط و تحقیق الفاظ عربی و فارسی میں ایک بے مثل رسالہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعد بہار عجم کے متعدد مثالوں کا ذخیرہ اس رسالے کے سوا کسی کتاب میں کم پایا جائے گا۔ افسوس جب فارسی کا رواج اُٹھ گیا تھا تو یہ رسالہ تالیف ہوا ورنہ مولف کی محنت کی پوری داد ملتی مگر اب بھی اردو زبان کے فصحا اس کو عزیز سمجھ سکتے ہیں اور اس کی محنت کی تھوڑی بہت داد مل سکتی ہے۔ میں جناب مولف کی اس محنت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ترقی روزافزوں کی دعا دیتا ہوں۔'' (یادگار وطن، ص 66)

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ 'ازاحتہ الاغلاط' میں ان فارسی الفاظ کی تفتیش و تحقیق کی گئی ہے جو عموماً غلط بولا جاتا ہے۔ شوق نیموی نے ان الفاظ کی تحقیق میں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور حوالوں کے لیے کئی اہم کتابیں اور لغات کا سہارا لیا۔ نیز شعرا کے اشعار بھی حوالہ کے طور پر پیش کیے۔ 'تحفۂ مدراس' جون 1888 میں اس کتاب پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس فارسی رسالہ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مؤلف اس کا ایک اعلیٰ درجہ کی فارسی لیاقت رکھنے والا ہے اور حددرجہ جانکاہی کی ہے۔ جب یہ رسالہ مرتب کیا ہے اس میں ہزاروں متروک اور

غلط الفاظ کا بیان مجدگانہ فصلوں میں برعایت حروف تہجی باسناد و اشعار اساتذہ مسلم الثبوت سے لکھا گیا ہے اور آخر میں بعض فوائد نشور اور اختلاف حرکات کا بیان ہے۔ ملک کو اس کے مؤلف مکرمی مخدومی جناب مولوی محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی کا احسان ماننا ہوگا جس نے غلطی کی تاریکی میں تحقیق کی روشنی دکھا دی اور ہمیں ٹھوکریں کھانے سے بچایا۔ غرض یہ رسالہ اپنے طرز میں پہلا ہے۔شعرا کو اس کتاب کا دیکھنا خالی از استفادہ نا ہوگا۔

یادگار وطن

'یادگار وطن' شوق نیموی کی سوانح ہے جو 154 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں مصنف نے اپنی بستی نیمی کا نہ صرف تعارف کرایا ہے بلکہ وہاں کی شخصیتوں کے بارے میں معلومات پہنچائی ہے۔اس کتاب کے سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اکثر حضرات نے تذکرے لکھے ہیں اور ملک عدم آباد کے رہنے والوں کا نام روشن کر کے ان کی روحوں کو خوش کیا ہے۔ میں بھی اپنے قلم اعجاز رقم کی مدد سے ان غریبوں کا تذکرہ لکھ کر ان کے ناموں میں بقا کی روح پھونک دوں جس سے قیامت تک ان کا نام صفحہ عالم پر روشن رہے۔اور ناظرین خصوصاً ان کے خاندان کے لوگ اپنے بزرگوں کا ذکر دیکھ کر دعائے خیر سے ان کی روحوں کو خوش کریں۔غرض کہ میں نے یہ سوچ کر کمر ہمت چست باندھی اور خوب چھان بین کر کے پہلے نیمی پر باترتیب حروف تہجی حضرات نیمی کے حالات و واقعات لکھ ڈالے اور اکثر جگہ قطعات تاریخ نظم کر کے درج کیے۔اور اس تذکرہ کا نام 'یادگار وطن' رکھا۔ چونکہ جا بجا اس میں مفید باتیں درج کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ صاحب بصیرت ہیں اگر نظر غور سے دیکھیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ دل و جان سے پسند کریں گے اور طرز تحریر سے خوش ہو کر اور فوائد عجیبہ و مباحث غریباں سے نفع اٹھا کر مؤلف کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔ (یادگار وطن)

'یادگار وطن' میں شوق نیموی نے اپنی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں اور اپنے آبا و اجداد کا سلسلہ نسب، تاریخی واقعات، کہاں تعلیم حاصل کی، اساتذہ کا ذکر، تصنیفات و تالیفات

کا تذکرہ اور شاعری کے نمونے قلم بند کیے ہیں۔ اسی کتاب میں جلال لکھنوی کے ساتھ ادبی معرکہ کا بھی ذکر ہے۔ ان کی کتابوں پر جو تبصرے شائع ہوئے اور ماہر فن نے جو رائے قلم بند کیے اس کو بھی شامل کیا ہے۔

شوق نیموی نے نیمی کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر چہ نیمی کوئی شہر نہیں، کوئی بڑا قصبہ نہیں، جہاں دیکھو وہاں غربا ہی کے ٹوٹے پھوٹے گھر نظر آئیں گے مگر پھر بھی ایسی دلکش جگہ ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

'یادگار وطن' میں وہ خط بھی شامل ہے جس میں شاد عظیم آبادی اور دوسرے ادبا نے شوق نیموی کی تعریف کی ہے۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

> ''مجمع کمالات مصدر حسنات کاشف رموز سخن ماہر فن مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی دامہ برکاتہم تسلیم باہزاراں شوق ملاقات و تکریم۔ یہ نیاز نامہ ہم لوگ نہایت خلوص دلی سے خدمت عالی میں بھیجتے ہیں اور شکر گزاری آپ کی ان تصانیف محققانہ کی نسبت ادا کرتے ہیں جن کو آپ نے بڑی کوششوں اور جانفشانیوں سے ملک کی نفع رسانی کے لیے مرتب فرما کر چھپوا دیا۔ 'ازاحۃ الاغلاط' اور 'اصلاح' یہ دونوں کتابیں علی الخصوص ہم اہل عظیم آباد کے لیے مایۂ ناز ہیں اور ہم لوگوں کو بے شک اس بات کا فخر ہے کہ ہمارے وطن نے ایسی ترقی کی کہ ملک بھر کے ممتاز لوگ اس کی قدر کرتے اور آپ کی تصانیف سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔''
> (یادگار وطن، ص 74)

یہ حقیقت ہے کہ شوق نیموی کی تحریریں محض وقت گزاری کا سامان نہیں بلکہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہیں۔ شوق نیموی کو علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ اس لیے بہار سے لکھنؤ جانے کا قصد کیا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''شادی کے بعد یہ قصد ہوا کہ اب لکھنؤ چل کر تحصیل علم کیجیے اور وہاں کی بہار لوٹیے۔ یہ قصد کر کے میں نیمی سے غازی پور پہنچا اور دو چار روز رہ کے وہاں سے رخصت ہوا۔ احباب غازی پور گنگا کے کنارے تک چھوڑنے آئے۔ برسات کا زمانہ تھا۔ اِدھر مینہ کی جھڑی بندھی اور اُدھر درد جدائی سے دل بھر آیا۔

ابر می بار دومن میشوم ازیارجدا
من جدا گر یہ کناں ابرجدا یارجدا

(یادگار وطن، ص 58)

'یادگا وطن' میں شوق نیموی نے لکھنؤ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور وہاں کے تعلیمی ماحول اور مشاعروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ تجربہ کار وہی واقعات بیان کرتا ہے جس میں وہ خود ذاتی طور پر حصہ لیا ہے۔ شوق نیموی نے 'یادگار وطن' میں وہی سب کچھ لکھا ہے جو ان کا دیکھا بھالا تھا۔

شوق نیموی کو بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور یہی شوق انھیں غازی پور اور لکھنؤ تک لے گیا اور وہاں انھوں نے جید علما سے تعلیم حاصل کر کے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی اور ایسی ایسی کتابیں لکھیں جس کی مثال نہیں ملتیں۔ 'یادگار وطن' میں اپنے بارے میں وہ سب کچھ لکھ دیا جو لکھ سکتے تھے۔ یہ کتاب شوق نیموی کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

سیر بنگال

شوق نیموی 20 ذی قعدہ 1319ھ میں سفر کولکتہ کیا تھا تا کہ ایشیاٹک سوسائٹی کی اہم کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔ کولکتہ کے علاوہ دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور کئی احباب و رشتہ دار اور ادبا و شعرا سے ملاقات کی۔ اس سفر کی پوری روداد 'سیر بنگال' میں قلم بند کر دیا۔ 26 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ احسن المطابع، پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس مختصر سے رسالے میں سفرنامہ کی پوری خوبی موجود ہے اور بنگال میں گزارے اوقات کی مختصر مگر جامع بیان درج ہے۔ اس رسالہ کی وجہ سے شوق نیموی سوانح نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

رسائل: 'اصلاح'

لکھنؤ میں قیام کے دوران شوق نیموی نے 'اصلاح' نام کا ایک رسالہ لکھا جو 1893 میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ 31 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ عربی و فارسی الفاظ کی تحقیق اور اُردو زبان و بیان کی اصلاح کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ یہ رسالہ شائع ہوتے ہی اہل علم نے

ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کا پہلا ایڈیشن دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

رسالہ 'اصلاح' کو 1918 میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے اُردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا اور تیسرا ایڈیشن اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ نے 1982 میں شائع کیا۔ اس رسالہ کے متعلق شوق نیموی رسالہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''استادی حضرت تسلیم جیسے کہنہ مشق شاعر کا قول ہے:

ابھی سے کیا کریں دعویٰ شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے جو عمر بھر نہیں آتا

مگر چونکہ اکثر نوآموزوں کو اُردو شاعری کے لق و دق وادی میں سرگرداں پایا اور جابجا ٹھوکریں کھاتے دیکھا۔ نہ اُن کے ساتھ کوئی رفیق شفیق ہے کہ اس ہرزہ خیالی سے باز رکھے اور نہ کوئی خضر رہنما ہے کہ سیدھی راہ بتائے۔ جس طرف جی میں آیا چل نکلے اور جدھر طبیعت چاہی قدم بڑھا دیے۔ نہ بلندی کے چڑھنے کا لحاظ اور پستی کے اُترنے کا خیال۔ زمانے نے کتنے پلٹے کھائے مگر اُن کی پرانی چال نہ بدلی۔ اس کا کچھ خیال ہی نہیں کہ عالم میں کبھی کیا ہوا تھا اور اب کیا ہوتا ہے۔ میرے جوش ہمت نے غایت ہمدردی سے اس امر کو قبول نہ کیا اور مجھے ایک چھوٹے سے مفید رسالے کی تالیف پر آمادہ کیا۔ اب میں اپنی مختلف معلومات کو قلمبند کر کے 'اصلاح' نام رکھتا ہوں اور نہایت خوشی سے شائقین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ انصاف پسند حضرات جب اس کا ملاحظہ فرمائیں گے، مؤلف کو کلمۂ خیر سے یاد فرمائیں گے۔ وما توفیقی الّا باللہ۔''

شوق نیموی نے واضح کر دیا ہے کہ اس رسالہ کی تالیف کا اُن کا مقصد کیا ہے۔ اس رسالہ میں مختلف عنوان جیسے تعقید لفظی، حشو، مقدرات، شتر گربہ، پہلوئے ذم، مبتذل مضامین متروکات، تذکیر و تانیث، ایطا، فوائد متفرقہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے جس سے زبان کی اصلاح کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

جب یہ رسالہ شائع ہوا تو اس وقت کے کئی اخباروں میں تبصرے شائع ہوئے۔ چند تبصرے ملاحظہ فرمائیے:

'اصلاح' نام کا ایک اردو رسالہ جناب مولوی محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی مقیم لکھنؤ نے تصنیف فرما کے چھپوایا ہے جو طالبان فن شعر و انشا وغیرہ کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مدت تک کسی اعلیٰ درجے کے کامل و محقق کی خدمت میں رہے جب بھی ممکن نہیں کہ اس قدر فائدہ حاصل ہو سکے جتنا کہ اس بیس صفحے کے رسالے کے دیکھنے سے ایک ساتھ میں ہو سکتا ہے۔ (مشیر قیصر، لکھنؤ، 21 جون 1887)

ثم باللہ آپ کی ان کتابوں کا نظیر و عدیل ہی نہیں۔ کچھ مبتدی ہی پر موقوف نہیں۔ منتہی کو بھی انتہا سے زیادہ مفید ہیں۔ قاعدہ ہے کہ بعض الفاظ غلط ایسے مشہور و زبان زد ہوئے ہیں کہ ان پر غلطی کا گمان ہی نہیں ہوتا کہ انسان ان کی تحقیق کرے۔ اس سبب سے انھیں لغت میں نہیں دیکھتا اور وقت پر ذلیل ہوتا ہے۔ ان کتابوں نے بیٹھے بٹھائے بے محنت مفت میں سب کو سب باتوں سے باخبر کر دیا۔ میں تو صاف آدمی ہوں واللہ مجھے تو اکثر الفاظ کا فائدہ ہوا چاہے کوئی اور نہ قبولے مگر میں احسان فراموش اور ہٹ دھرم نہیں ہوں۔ مجھے جس قدر آپ کی ان کتابوں کو دیکھ کر سرور ہوا اور مطبوع خاطر ہوئیں اسی قدر رنج بھی ہوا، وہ یہ کہ افسوس آپ نے ان جواہرات کو لٹا دیا۔ ان لوگوں کو جنھیں سوا موزوں کرنے کہ اور نسبت کی خبر ہی نہ تھی کہ شاعری کیا چیز ہے اور استادی کا دعویٰ فرمایا کرتے تھے اب آپ کی بدولت وہ لوگ بھی کچھ ہو جائیں گے اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ کاش اس سے فائدہ اٹھا کر کچھ احسان ہی مانے یہ بھی نہیں۔ (شبیر علی رسا، 11 جنوری 1890)

شوق نیموی نے اس رسالہ میں فن شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں فاعل کو فعل و مفعول سے پہلے اور فعل کو سب سے آخر لانا چاہیے جیسے تم نظر اٹھاؤ اگر اس کو یوں کہیں کہ تم اٹھاؤ نظر یا اٹھاؤ نظر تم یا نظر تم اٹھاؤ تعقید ہو جائے گی۔''

حشو کے تعلق سے وہ کئی مصرعوں کی اصلاحات پیش کی ہیں۔

شب وصل میں وہ خفا ہو گیا

(اصلاح ۔ شب وصل وہ بت خفا ہو گیا)

دیکھ کر کے رخ تاباں کو ترے اے جاناں

(اصلاح ۔ دیکھ کر عارض پر نور ترا اے جاناں)

شترگربہ: ایک ہی چیز کو تعظیم اور تحقیر دونوں کے ساتھ استعمال کرنا شترگربہ ہے، اگر ایک ہی جملہ میں صراحتہً ان دونوں کا اجتماع ہو تو محض نادرست ہے جیسے ہم کہتا ہوں، تم کہتا ہے اور اگر مختلف جملوں میں ہو اور وہ جملے ایک ہی شعر میں نہ ہوں تو درست ہے ورنہ نادرست ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال اس شعر میں پیش کی گئی ہے:

تیری باتوں کا کیا ٹھکانہ ہے

آپ کا شاکی اک زمانہ ہے

پاس جب سے ہمارا یار نہیں

دل کو ایک دم مرے قرار نہیں

مگر تو اور تم اور آپ اور تم کا اجتماع ایک شعر میں نادرست نہیں اس کہ وجہ یہ ہے کہ مخاطب کی تین صورتیں ہیں۔ ادنیٰ اس کے لیے تو موضوع ہے اور اوسط اس کے لیے تم موضوع ہے اور اعلیٰ اس کے لیے آپ موضوع ہے۔ چونکہ تم توسط کے درجے میں ہے اس سبب سے اس کو تو اور آپ دونوں کے ساتھ فی الجملہ مناسبت ہے۔ جب تو و تم اور تم و آپ دو جملوں میں واقع ہوں گے تو ایک قسم کا پردہ ہو جائے گا۔ وزیر:

آئیو دامن اٹھائے مدفن عشاق پر

ہاتھ لے جائے نہ کوئی ترے دامان کی طرف

مومن:

یہ تم نے نئی طرح نکالی

معشوقی ہے آپ کی نرالی

نسیم دہلوی:

یہ شوخیاں تمہاری لکھی ہوئی ہیں دل پر

آخر کبھی تو مرے قابو میں آئیے گا

ذات شریف ہو تم میں خوب جانتا ہوں
طوفان اور کوئی مجھ پر اٹھایئے گا

وزیر:

نثار کرتے ہیں آ دیکھو جاں نثار کے پاس
گلے کو آپ کے خنجر پہ سر کو ٹھوکر پر

گویا:

محمد سے صفت پوچھو خدا کی
خدا سے پوچھئے شان محمدؐ

مبتذل مضامین کے حوالے سے شوق نیموی نے بہت اچھی بات لکھی ہے۔ بعض حضرات جن کو جدّت کا شوق رہتا ہے کہیں کہیں ایسے شعر کہتے ہیں کہ صحیح مذاق والوں کے ذائقہ زبان پر روکھے پھیکے، کڑوے کسیلے معلوم ہوتے ہیں جیسے:

چھرا چلا فلک پہ بت خانہ جنگ کا
چھوٹا ہے نیل گاؤ پہ کتا تفنگ کا
کشتہ چشم کی تربت کا چرے گر سبزہ
پیٹ سے بکری کے ہو بچہ، آہو پیدا
طفل گانہ کے عشق میں آخر
جان سے اپنی ہاتھ دھو بیٹھے
اڑائے پھرتی ہے باد مخالف مجھ کو گردوں پر
نہیں معلوم کھتّی ہوں کہ چھبی کا پچھلا ہوں
اس قدر لاغر ہوئے ہیں ہم خیال زلف میں
اب سواری کو ہماری ایک جون درکار ہے

اور جب یہ حضرات بدرجاچ ہونا چاہتے ہیں تو اس قسم کے شعر کہنے لگتے ہیں:

پیٹوں سر سُن سُن کے گانا اُس بت بے پیر کا
دائرہ بجنے لگے حرفِ خط تقدیر کا

بلند پروازی و جدّت ایک عمدہ چیز ہے مگر مزے کے ساتھ ہو۔ غزل میں عشقیہ مضامین درد آمیز معانی، پاکیزہ خیالات، سلجھی ہوئی ترکیبیں، نکھری ہوئی بندشیں، دلکش الفاظ، چلبلے جملے، مربوط مصرعے پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہیے۔ چونکہ سابق زمانے سے اکثر دلّی والوں نے ان امور کا خیال رکھا ہے، اس وجہ سے اس کو دلی کا رنگ کہتے ہیں۔ میر و درد کا کلیات، نسیم دہلوی کا دیوان، داغ کا کلام دیکھو کہ کس قدر مقناطیسی اثر رکھتا ہے۔

ایضاح

شوق نیموی کا رسالہ 'اصلاح' جب شائع ہوا تو اہل علم وفن نے اس رسالہ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور جلد ہی دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ شوق نیموی نے رسالہ 'اصلاح' پر نظر ثانی کی اور 'ایضاح' کے نام سے اس پر خود حاشیہ لکھا۔ 1893 میں جب 'اصلاح' دوبارہ چھپی تو اس کو بھی اس میں شامل کرلیا۔ 'ایضاح' کے تعلق سے شوق نیموی نے حاشیہ میں لکھا ہے:

> ''امابعد خادم ارباب سخن ابوالخیر محمد ظہیر احسن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ کئی سال ہوئے ایک مفید رسالہ جس کا نام 'اصلاح' ہے تالیف کرکے میں نے ہدیۂ ناظرین با تمکین کیا۔ ملک نے نہایت قدر دانی کی۔ اخبار والوں نے بہت کچھ تعریف لکھی۔ حضرات دہلی ولکھنؤ نے بھی نہایت پسند کیا۔ جناب خورشید لکھنوی نے اپنے رسالہ 'افادیت' میں بہت کچھ مدح تحریر فرمائی بلکہ بعض جگہ اپنے رسالے میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی اس کے حوالے دیے ہیں۔ المختصر اس رسالے نے بہت کچھ حسن قبول پیدا کیا اور بات کی بات میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ جناب نثار مہتمم پیام یار نے دوبارہ چھاپنے کے لیے چند بار مجھ سے اجازت طلب کی۔ آخر ان کے اصرار سے پہلے نظر ثانی کی۔ جابجا خود اثبات کا اتفاق ہوا گھٹانے بڑھانے کی نوبت آئی:
>
> نقاش نقش ثانی بہتر کند ز اول جب نک سک سے درست ہوگیا تو اس پر مختصر سا حاشیہ لکھا اور 'ایضاح' نام رکھا۔''

سرمۂ تحقیق

شوق نیموی کا رسالہ 'ازاحتہ الاغلاط' جب شائع ہوا تو اہل علم و ادب نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس رسالہ میں جلال لکھنوی کی 'تنقیح اللغات' کے بعض تحقیقات سے اختلاف کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے جلال لکھنوی جیسے شاعر یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ایک نوجوان ان کی کتاب پر تنقید کرے۔ وہ ناراض ہوئے اور اس کے جواب میں 'تردید' نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے شاگرد کے نام سے چھپوا دیا۔ شوق نیموی جب علوم دینیہ سے فارغ ہوکر 1887 میں گھر واپس آئے تو انھوں نے 'تردید' کے جواب میں 'سرمۂ تحقیق' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ یہ رسالہ چھپن صفحات پر مشتمل ہے جس میں جلال لکھنوی کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اُن کی اصلاح کی گئی ہے۔ حوالے کے طور پر شوق نیموی نے معتبر کتابوں سے مدد لی۔

شوق نیموی نے 'سرمۂ تحقیق' لکھنے کا سبب یوں بیان کیا ہے:

''ناچار 'سرمۂ تحقیق' نام رکھ کر قلم اٹھاتا ہوں۔ 'ازاحتہ الاغلاط' کو نک سک سے درست اور اس کی رد کو آٹھوں گانٹھ کست سائے دیتا ہوں کسی صاحب مذاق نے اوستاد کے مصرعے پر مصرعہ لگا کر یہ شعر کہا ہے:

من ترا حاجی بگویم تو مرا جی حاجی بگو
گر ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

اس کے لکھنے سے غرض یہ ہے کہ 'ازاحتہ الاغلاط' نہایت تہذیب سے لکھی گئی ہے اور حضرت جلال ایک عمدہ لقب میں بعض اجلۂ عصر سے تعبیر کیے گئے ہیں۔ مناسب یہ تھا کہ رد و قدح میں تہذیب کا سلسلہ ہاتھ سے نہ چھوٹتا مگر نہایت تعجب ہے کہ مہذب لوگوں کے خلاف شان حضرت نے دو چار جگہ ایسی سخت کلامی کی ہے کہ بیان سے باہر۔'' (سرمۂ تحقیق، شوق نیموی، ص 5، قومی پریس لکھنؤ)

اس رسالہ میں شوق نیموی نے جلال لکھنوی کے اعتراضات کا جواب مع حوالہ دیا ہے۔ محاورات اور مرکبات پر جو جلال لکھنوی نے تنقید کی تھی اس کی وضاحت کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''چشمت آں کرد کہ ہاروت بہ بابل نکند اے جناب آپ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

کہاں تک سمجھاؤں۔ مگر آپ کی خاطر ہی عزیز ہے ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں
کہ زہرہ کے سبب سے چاہ بابل میں مقید ہیں۔ لوگوں کو سحر تعلیم کیا کرتے تھے۔
قرآن اس پر ناطق ہے۔ وہ ماانزل الخ اس مصرعہ کا مطلب ہے کہ تیسری آنکھ نے
وہ سحر کیا کہ ہاروت بھی بابل میں ویسا سحر نہیں کرتا تھا۔ قولہ ہاروت نے بابل کے
ساتھ کیا کیا ہے۔ الخ لیجیے آپ بے کے معنی ساتھ کے لیتے ہیں۔ جبھی تو آپ شعر
کا مطلب نہیں سمجھتے۔ اے جناب یہاں بامعیت کی نہیں ظرفیت کی ہے جس کے
معنی 'میں' کہے جاتے ہیں۔'' (سرمۂ تحقیق، شوق نیموی، ص 8)

شوق نیموی جب بھی بات کرتے ہیں کتابوں کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ 'سرمۂ تحقیق' میں بھی اپنی رائے کو مستحکم کرنے کے لیے کئی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''سکھائے دلبری کے ڈھنگ ہم نے
فریب دوستی ظالم ہمیں سے

مہربان من ہرگز ہرگز یہ ترکی کا قاعدہ نہیں جو نے بعد حرف مکسور اور جو واؤ بعد
مضموم وہ غیر ملفوظ ہی ہوتا ہے ہاں البتہ ہے کہ الفاظ ترکی میں بعد حرف مکسور یائے
غیر ملفوظ اور بعد مضموم واؤ غیر ملفوظ بھی ہوتے ہیں جیسے یورش کہ اس میں واؤ حرف
علامت ضمہ ماقبل ہے اور اسی طرح تیمور میں یے واؤ دونوں ملفوظ ہیں۔''
(سرمۂ تحقیق، شوق نیموی، ص 10)

اسی طرح جمادی الاوّل اور جمادی الثانی پر بھی گرفت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
''قولہ جمادی الاولیٰ الخ حکیم صاحب نے تنقیح اللغات میں لکھا ہے کہ جمادی
الاول اور جمادی الثانی درست نہیں ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ
چاہیے۔ ازاحۃ الاغلاط میں اس کی رد لکھی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت کچھ
فائدے لکھے گئے ہیں۔ اب جو یہ جواب دیتے ہیں کہ صحت و غلطی کی تحقیق لغتہً کی
گئی تھی تصرفات اہل پارس پر نظر نہیں کی تھی مجھے اس جواب پر رحم آتا ہے مگر عذر
بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔'' (سرمۂ تحقیق، شوق نیموی، ص 16)

یہ حقیقت ہے کہ شوق نیموی زبان کے ماہر تھے اور جس طرح انھوں نے زبان پر کام کیا

ہے اس زمانے میں کسی نے نہیں کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

''قولہ اشہدان محمد الرسول اللہ انتہیٰ عوام جس طرح محمد الرسول اللہ مع الف و لام لکھا کرتے ہیں آپ نے بھی لکھ دیا۔ حالانکہ رسول اللہ میں ترکیب اضافی ہے۔ رسول پر الف لام داخل کرنا غلط ہے۔ یوں لکھنا چاہیے کہ اشہدان محمداً رسول اللہ۔ محمد کی تنوین رے سے بدل کر رسول کی رے سے مدغم ہوگئی ہے۔ حضرت جلال سے ایسی غلطی ہوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ قواعد عربیہ و املائے عربیہ کیا جانیں۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ جو شخص کلمہ بھی صحیح نہ لکھ سکے وہ اپنے محقق ہونے کا دعویٰ کیوں کرے۔'' (سرمہ تحقیق، شوق نیموی، ص 16)

○

شوق نیموی کی شعری نگارشات

سوز وگداز:

مثنوی 'سوز وگداز' عشق کی وہ داستان ہے جس پر زمانے اور وقت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اُردو مثنویوں میں عشقیہ داستان کی روایت رہی ہے جس کی پاسداری تقریباً سبھی مثنوی نگاروں نے کی ہے۔ 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر 'زہر عشق' اور اس کے بعد یہ سلسلہ 'سوز وگداز' تک پہنچتا ہے۔

'سوز وگداز' شوق نیموی کی مشہور مثنوی ہے جس میں محمد حسن اور شام سندر کی محبت کی داستان پیش کی گئی ہے۔ یہ مثنوی 1312 ہجری میں لکھی گئی اور نظامی پریس، پٹنہ سے شائع ہوئی۔ 46 صفحات پر مشتمل یہ مثنوی اُس دور کے شعرا کو بے حد متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اُس دور کے بڑے شعرا نے اور محقق نے اس مثنوی پر اپنی رائے بھی دی ہے۔

مثنوی 'سوز وگداز' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

میرا پیک خیال عرش پیما ‏ ‏ ‏ سواد حمد میں ہے جلوہ فرماں
یہی دل میں ہے فکر نکتہ داں کے ‏ ‏ ‏ کہ تارے توڑ لاؤں آسماں کے
دکھاؤں رفعت شیوہ بیانی ‏ ‏ ‏ بنوں شہباز اوج نکتہ دانی
کروں میں نظم کا رتبہ دوبالا ‏ ‏ ‏ کہ ہو ملک سخن میں بول بالا

شوق نیموی نے خود لکھا ہے کہ 'سوز وگداز' کا قصہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی اور تاریخی ہے جس کو وقوع پذیر ہوئے تقریباً دوسو سال ہو گئے۔ پٹنہ میں محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ایسا واقعہ پیش آیا تھا جسے میں نے مثنوی کے اشعار میں ڈھال دیا۔ مثنوی کا ہیرو پٹنہ سیٹی کے محلہ چھوٹی پٹن کا

رہنے والا تھا اور ہیروئین شام سندر پٹنہ سیٹی میں چوک کے قریب محلہ سندر باڑا کی رہنے والی تھی۔ یہ محلہ مہاجنوں سے آباد تھا اور شیام سندر ایک مہاجن کی لڑکی تھی۔

قصہ یوں ہے کہ شام سندر اپنی سہیلیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے سیر کو آئی تھی جب حسن نے شام سندر کو دیکھا تو اس پر عاشق ہوگیا۔شام سندر کے دل میں بھی عشق کی چنگاری جل اٹھی۔ وہ اندر ہی اندر عشق کی آگ میں جل رہی تھی۔ دونوں کی دیوانگی کا حال شوق نیموی نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اُس کے بعد مدّتوں حسن اُس کی جدائی میں تڑپتا رہتا ہے، مجنوں کی طرح بھٹکتا رہتا ہے اور ایک دن جوگی کا بھیس بدل کر شام سندر کی گلی میں بھیک مانگنے کی صدا لگاتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گھر کے سبھی لوگ سو رہے تھے۔ جب شام سندر کو پتہ چلتا ہے کہ کوئی جوگی اُس کی گلی میں آیا ہے تو وہ چھت پر آتی ہے۔ وہ حسن کو دیکھ کر پہچان جاتی ہے اور اپنے گلے کا مالا حسن پر گرا دیتی ہے۔حسن چھت کی طرف دیکھتا ہے۔اپنے محبوب کو دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے۔شام سندر غش کھا کر چھت سے گر جاتی ہے تو حسن اُسے اپنے ہاتھوں سے تھام کر اُسے زمین پر گرنے سے بچا لیتا ہے۔شام سندر جلدی سے اُس کی گود سے اُترتی ہے اور اپنے گھر کے اندر چلی جاتی ہے۔ وہاں موجود لوگ حسن کی بہادری کے قائل ہو جاتے ہیں۔

کچھ دن کے بعد حسن برہمن کا بھیس بدل کر شام سندر کے والد سے ملتا ہے۔اُس کے والد کتھا سننے کے بہت شوقین تھے اور سادہ لوح انسان تھے۔ وہ حسن کی عالمانہ گفتگو سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔حسن اپنا نام پرسا رام اور مسکن کاشی بتاتا ہے۔شام سندر کے والد حسن کو اپنے گھر کتھا سننے کے لیے لے کر آتے ہیں۔ وہ روز کتھا خوانی میں مصروف رہتا ہے۔اسی موقع پر پہلی بار حسن اور شام سندر روبرو ہوتے ہیں۔شام سندر، حسن کو سمجھاتی ہے کہ ہم لوگ نہیں مل سکتے کیونکہ دونوں کا مذہب علیحدہ ہے۔ میرے والد کبھی یہ برداشت نہیں کریں گے۔ حسن ایک مہینہ وہاں رہ کر واپس ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد شام سندر کی شادی دوسرے شخص سے طے ہو جاتی ہے۔ شادی کی رات گھر میں آگ لگ جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔

حسن بھیس بدل کر وہاں موجود تھا۔ وہ شام سندر کو گود میں اُٹھا کر ایک کھڑکی کے راستے سے باہر آ گیا اور اُسے اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں آگ لگنے کی وجہ سے افراتفری پھیلی تھی۔ اس لیے کسی نے حسن اور شام سندر کو نہیں دیکھا۔ سبھی نے یہ سمجھ لیا کے دولہے کے ساتھ دلہن بھی جل کر خاک ہو گئی۔ جب صبح ہوئی تو حسن شام سندر کو گھر پہنچانا چاہا لیکن شام سندر نے منع کر دیا کہ اگر میرے والد کو پتہ چلے گا کہ میں ایک رات تمہارے گھر رہ کر آئی ہوں، وہ اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ گھر والوں نے مجھے مردہ تسلیم کر لیا ہے۔ اس لیے میں اب آپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ حسن شام سندر کو اپنی نکاح میں لے لیتا ہے۔ کچھ دن بڑے آرام سے زندگی گزرتی ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد حسن اپنے دوستوں کے ساتھ چھتر کا میلہ دیکھنے کے لیے گنگا کے پار کشتی پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ کچھ دنوں تک میلوں کا لطف اٹھاتا ہے جب گھر واپس ہو رہا تھا کشتی اُلٹ جاتی ہے اور کچھ لوگ غرق آب ہو جاتے ہیں لیکن حسن کسی طرح بچ جاتا ہے۔ شام سندر کو لوگوں نے یہ خبر دے دی کہ کشتی اُلٹ جانے سے حسن گنگا میں ڈوب گیا اور اُس کی جان چلی گئی۔ یہ خبر سن کر شام سندر کا انتقال ہو گیا۔ گاؤں والوں نے اس کو دفن کر دیا۔

حسن گھر پہنچا تو شام سندر کی موت کی خبر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ دیوانوں کی طرح کبھی شام سندر کی قبر پر چراغ جلاتا، کبھی اُس سے لپٹ کر روتا رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دیکھنے میں آیا کہ ایک شعلہ ہودج کی شکل میں آسمان سے دریا کی طرف اُترتا ہے اور دیر تک سراسیمہ و بے قرار ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے اور نہایت حسرت آمیز اور دردانگیز لہجہ میں حسن کو یاد کرتا ہے۔ یہ شام سندر کی روح ہے جو ہودج نورانی پر سوار ہو کر حسن کی تلاش میں آتی ہے۔ حسن بھی اُس شعلہ سے لپٹ کر اپنی جان دے دیتا ہے۔

مثنوی 'سوز گداز' کا قصہ مختصر ہونے کے باوجود گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس مثنوی میں صرف دو کردار ہیں۔ ہیرو حسن اور ہیروئین شام سندر، اس کے علاوہ شام سندر کے والد اور حسن کے چند دوست۔ حسن کا کردار بے حد اہم ہے۔ اس کے اندر ایک روایتی عاشق کی ساری خوبیاں موجود ہے۔ اس کے شب و روز عیش و عشرت میں بسر ہوئے ہیں لیکن شام سندر

پر عاشق ہونے کے بعد اُس کی کیفیت بدل جاتی ہے اور وہ قیس و فرہاد کی طرح دیوانہ وار گھومتا نظر آتا ہے۔ محبوب کی ایک نظر پانے کے لیے بے قرار ہوا اٹھتا ہے۔ محبوب کے فراق میں تڑپتا رہتا ہے لیکن کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے اُس کا محبوب بدنام ہو یا اُس کے عشق کا کسی کو پتہ چلے یعنی وہ ایک شریف النفس انسان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس کے عشق کا کسی کو پتہ چل گیا تو بہت بدنامی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے دیدار کے لیے کبھی جوگی بنتا ہے اور کبھی پنڈت بن کر کتھا سناتا ہے اور جب شادی کی رات شام سندر کے گھر میں آگ لگتی ہے تو شام سندر کو آگ سے بچا کر اپنے گھر لے آتا ہے۔ یہ تمام واقعات حسن کے کردار کو مضبوطی فراہم کرتے ہیں۔ دوسری مثنویوں کے ہیرو کی طرح یہ بزدل اور کمزور نہیں ہے۔ اپنے محبوب سے عشق بھی کرتا ہے مگر اسے بدنام بھی نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن ایک ایسا کردار ہے جو شروع سے آخر تک اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

مثنوی 'سوز و گداز' کی ہیروئین شام سندر نہایت حسین و جمیل لڑکی ہے جسے دیکھ کر حسن اُس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس قدر دیوانہ ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے گھر تک پہنچ جاتا ہے۔ شام سندر ایک شریف اور عزت دار لڑکی ہے۔ وہ بھی دل ہی دل میں حسن کو چاہتی ہے مگر اظہار محبت کرنے سے ڈرتی ہے کیونکہ وہ دوسرے مذہب کی ہے۔ لیکن عشق کو زیادہ دنوں تک دبایا نہیں جاسکتا۔ جب حسن اُس کی گلی میں جوگی بن کر بھیک مانگتا ہوا اس کے گھر تک پہنچتا ہے تو وہ چھت سے حسن کو پہچان کر غش کھا کر گر پڑتی ہے اور حسن اسے گود میں سنبھال لیتا ہے۔ جب حسن اس کے گھر میں پنڈت بن کر کتھا سنا رہا ہوتا ہے، وہاں بھی جذبات محبت کھل کر سامنے نہیں آتی بلکہ حسن کو بتاتی ہے کہ ہم دونوں کا مذہب الگ ہے اور میرے والد کبھی ہماری شادی نہیں ہونے دیں گے۔

شام سندر کا کردار وہاں کھل کر آتا ہے جب حسن اسے شادی کی رات گھر میں آگ لگنے کی وجہ سے محفوظ بچا کر اپنے گھر لے آتا ہے اور جب اسے واپس اس کے گھر لے جانا چاہتا ہے تو شام سندر صاف انکار کر دیتی ہے کہ میں تمہارے گھر ایک رات رہ چکی ہوں اور یہ بات میرے والد کبھی گوارا نہیں کریں گے۔ وہ غیرت سے مر جائیں گے۔ اس لیے اب میں ہمیشہ

تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

شام سندر کا کردار وہاں بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جب اسے حسن کے گنگا میں ڈوب کر مر جانے کی خبر ملتی ہے اور اس خبر کی تاب نہ لا کر اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شام سندر کے اندر وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک روایتی ہیروئین میں ہوتی ہے۔

مثنوی 'سوز وگداز' میں مافوق الفطری عناصر نہ کے برابر ہیں۔ صرف ایک موقع پر شوق نیموی نے اس کا استعمال کیا ہے۔ جب شام سندر انتقال کر جاتی ہے تو حسن دیوانوں کی طرح اس کی قبر پر چراغ جلاتا ہے اور اس کی قبر سے لپٹا رہتا ہے تو شام سندر ہودج کی شکل میں آسمان سے دریا کی طرف اترتی ہے اور حسن کو یاد کرتی ہے۔ اور حسن اس آگ سے لپٹ کر ہمیشہ کے لیے شام سندر کا ہو جاتا ہے۔ شام سندر کے کردار میں خودداری ہے۔ ایک طرف وہ اپنے مذہب کا بھی خیال رکھتی ہے۔ دوسری طرف حسن کی محبت میں اس قدر گرفتار ہے کہ شادی کی رات زہر کھا کر مر جانا چاہتی ہے۔

مثنوی 'سوز وگداز' کی دلکشی کا جادو داغ دہلوی کے سر چڑھ کر بھی بولا ہے۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں:

مثنوی جس کا نام سوز گداز — اس سے بہتر نہیں فسانۂ شوق
حضرت شوق کی ہے یہ تصنیف — باعث رونق زمانۂ شوق
معدن طبع میں ہے گوہر عشق — مخزن دل میں ہے خزانۂ شوق

یہی نہیں پروفیسر مظفر اقبال نے اس مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

''مثنوی 'سوز وگداز' ایک کامیاب المیہ مثنوی کہی جا سکتی ہے۔ جناب شوق نیموی نے مثنوی کے مختلف اجزائے ترکیبی کی تنظیم و ترتیب میں بے مثال فنکارانہ صلاحیت سے کام لیا ہے۔ پلاٹ سازی میں اپنی چابکدستی کا ثبوت پیش کیا ہے اور کردار نگاری کے بھی نہایت عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ خصوصاً شام سندر کی سیرت کی پیش کش میں بہت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ مناظر کی تصویر کشی میں بھی شوق

نیموی کامیاب نظر آتے ہیں۔ اسلوب بیان میں رنگینی و رعنائی ضرور ہے اور صنعتوں کا استعمال بھی دل کھول کر کیا گیا ہے لیکن شگفتگی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی مقام پر بھی انداز بیان میں بوجھل پن اور اغلاق نظر نہیں آتا۔ واقعات کے بیان میں بے جا طوالت سے پرہیز کیا گیا ہے اور مناسب ایجاز واختصار سے کام لیا گیا ہے۔'' (مثنوی 'سوز و گداز'، پروفیسر مظفر اقبال، ص 37)

یہ مثنوی بحر ہزج مسدّس محذوف الآخر میں لکھی گئی ہے۔

مثنوی کے آخر میں شوق نیموی نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہوئی بزم سخن سنسان ساقی　　ہزاروں ہیں ابھی ارمان باقی
اوبل کر رہ گیا میخانہ دل　　لہو سے بھر گیا پیمانہ دل
جو لکھا میں نے یہ افسانہ عشق　　ہوا بیخود دل دیوانہ عشق
برنگ گیسوئے پرپیچ جاناں　　ہوا مجموعۂ خاطر پریشاں
ہوئے زخم دل صد چاک آلے　　کھلے سینے میں داغِ غم کے لالے

شوق نیموی نے مثنوی 'سوز و گداز' میں فضا آفرینی اور منظرکشی کا خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے۔ شاعر نے اشعار کے ذریعے جیسے فلم دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مختلف موقعوں پر ایسا منظر سامنے آتا ہے کہ دل سے واہ کی آواز نکلتی ہے۔

جب شام سندر گنگا ندی میں نہانے کے لیے اترتی ہے تو شاعر کتنا پرکیف تصویرکشی کرتا ہے۔

جو دھویا پنجہ، دست حنائی　　غضب کی آگ پانی میں لگائی
ادا سے دھو کے زلف عنبریں کو　　کیا برباد موئے مشک چیں کو
نہانے کو جو دریا میں در آئی　　حباب موج نے کی جبہ سائی

اور جب حسن، شام سندر کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو یہ منظر دیکھیے:

تجھے اے شام سندر کچھ خبر ہے　　کہ میرا حال کیا شام و سحر ہے

محبت میں تری کیا آفت آئی　　ترے غم میں کڑی کیسی اٹھائی
تری الفت میں دیوانہ بنا میں　　جہاں میں ننگ افسانہ بنا میں

اور جب سادھو کے بھیس میں شام سندر کی گلی میں حسن پہنچتا ہے تو یہ منظر کتنا دلکش ہے:

بھبھوت اس نے ملا باندھا لنگوٹا　　لیا اک دپنا اور ایک لوٹا
بغل میں مرگ چھالا اک بنایا　　سراپا سوانگ سادھو کا بنایا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پوری مثنوی میں منظر کشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سارا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

مثنوی 'سوز و گداز' میں ایک ہی واقعہ ایسا بیان کیا گیا ہے جسے ہم غیر معمولی کہہ سکتے ہیں۔ جب شام سندر ہودج نور پر سوار ہوکر آسمان سے گنگا کنارے اترتی ہے۔ یہ واقعہ غیر فطری ہوسکتا ہے لیکن شوق نیموی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس دلچسپ مثنوی میں کوئی واقعہ خلاف عقل نہیں مگر صرف یہی ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جس میں شاید لوگوں کو کلام ہو۔ مگر روح کا کسی نورانی شکل میں متشکل ہوکر آنا نا عرفاً مستبعد ہے نا شرعاً بلکہ جو لوگ مسمریزم کے عجائب و غرائب سے کچھ خبر رکھتے ہیں وہ بلا تامل اس کی تصدیق کر سکتے ہیں تاہم اگر واقعات پر نظر نہ ہوتی اور متعدد ثبوت کا لحاظ نہ ہوتا تو نئی روشنی والوں کی خاطر سے ہم اس کو فاسفورس کہہ دیتے مگر ہمیں تو یہی کہتے بنتا ہے کہ یہ سب آتش عشق کی حرارت کے نیرنگ تھے۔'' (مثنوی 'سوز و گداز'، ص 36)

جب حسن نے شام سندر کو دیکھا تو اس پر عاشق ہو گیا۔ شام سندر کے دل میں بھی عشق کی چنگاری جل اٹھی۔ وہ اندر ہی اندر عشق کی آگ میں جل رہی تھی۔ دونوں کی دیوانگی کا حال شوق نیموی نے بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے:

ادھر وحشت ادھر وارفتگی تھی　　ادھر حسرت ادھر دلبستگی تھی
ادھر ہر لحظہ جوش اشک باری　　ادھر ہر اک قدم پر ہے بیقراری
ادھر وہ نوجواں کہتا تھا دل میں　　پھنسا میں کس بلائے جاں گسل میں

مرا دل آج قابو میں نہیں ہے جگر کی طرح پہلو میں نہیں ہے
ادھر کہتی تھی وہ زہرہ شمائل کہ مرا اس طرح کیوں ہو گیا دل
مجھے کیا کوئی شیدائی بنا ہے بلا سے میری، سودائی بنا ہے
کھلائے گا گل اک دن عشق کافر اڑے گی یہ خبر بو ہو کے آخر

جب شام سندر اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے تو حسن بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک چلا جاتا ہے۔ شام سندر گھر کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور شام سندر اس کے عشق میں گرفتار ہو کر جنگل میں گھومتا رہتا ہے۔ اس کے فراق میں صحرا کی طرف نکل جاتا ہے۔ مدّتوں اس کے فراق میں تڑپتا رہتا ہے اور دیدار یار کی خاطر کوچۂ یار میں مجنوں کی طرح دیوانہ وار پھرتا رہتا ہے۔

ادھر شیام سندر کو بھی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا عاشق صحرا کی خاک چھان رہا ہے۔ گھر کے لوگ جب حسن کی اضطرابی کیفیت دیکھتے ہیں تو اسے زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ وہ گھر میں قیدی کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ حسن ہر لمحہ شام سندر کی یادوں میں ڈوبا رہتا اور خواب میں بس اسے ہی دیکھتا رہتا:

حسن کے پاس آ پہنچی ادا سے مگر نیچی نظر جوش حیا سے
ہوا جس دم شرف اندوز دیدار بنا پروانۂ شمع رخِ یار
اک آہ نیم کش کھینچی جگر سے پھر آیا اس پری کا دل جو غم سے

شام سندر کے عشق میں بھی شدت اور صداقت ہے۔ وہ حسن کو اس قدر چاہتی ہے کہ اس کے غم میں اپنی جان نچھاور کر دیتی ہے۔ اور اس کے فراق میں شعلہ جوالہ کی شکل میں زمین و آسمان میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہے یہاں تک کہ جب حسن اس سے جا کر مل جاتا ہے تو اسے چین نصیب ہوتا ہے۔

کسی ہمدم کو دے کر برق آسا سوئے شعلہ ہوا وہ گام فرسا
پکارا شام سندر شام سندر حسن میں ہوں پریشاں حال و ششدر
غرض لپکا ادھر سے کچھ وہ مہجور ادھر سے کچھ بڑھا وہ ہودجِ نور

ہوئے سرگرم رقص و وجد باہم ہوئی مُڈھ بھیڑ ان دونوں میں جس دم
ہوا رونق فروزِ ہودج نور حسن تھا جذبِ الفت سے جو مجبور
بھڑک اٹھا چراغِ خانۂ عشق در آیا شعلہ میں پروانۂ عشق
اڑا پھر صورت تخت سلیماں ہوا مثلِ پری وہ شعلہ رقصاں
اٹھایا ہاتھ یاروں نے حسن سے فلک پر چڑھ گیا دم بھر میں سن سے
بہائے آسماں نے اشک شبنم سوادِ شب نے پہنا جامۂ غم

مثنوی 'سوز وگداز' حسن وعشق کا ایک دردخیز لیکن نہایت دلچسپ فسانہ ہے۔

نغمۂ راز:

'نغمۂ راز' 38 صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت مثنوی ہے جو 1882 میں شائع ہوئی۔ اس میں حسن وعشق کی داستان پُرکشش انداز میں بیان کی گئی ہے۔مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

طور سینائے وفا کا ہوں کلیم دل سے ہوں شیفتہ حسن قدیم
کاشفِ راز نہانی ہوں میں واقف سرمعانی ہوں میں
چشم بینائے طریقت میں ہوں دیدۂ حسن حقیقت میں ہوں

مثنوی 'نغمۂ راز' میں 534 اشعار ہیں جس میں ایک عاشق اور معشوق کی عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ اس میں جذبات نگاری، کردار نگاری، منظرکشی کا بے حد خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کی تعریف امیر مینائی اور تسلیم لکھنوی جیسے شعرانے کی ہے اور 'نغمۂ راز' کوشوق نیموی کی کامیاب مثنوی میں شمار کیا ہے۔

اس ضمن میں لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب خورشید رقم طراز ہیں: ''دوسرے بہر رمل مسدس مجنون، مخدوف فاعلاتن، فاعلاتن فعلن بحرکت عین جس میں مثنوی 'نغمہ راز' وغیرہ ہے۔''

شوق نیموی نے لکھا ہے کہ خدا کے فضل سے ہندوستان میں 'نغمہ راز' کا طوطی بولتا ہے۔

ونم ما قیل ع قبول خاطر و حسن سخن خداداد است۔ بہر کیف جب میری مثنوی 'نغمہ راز' پہلی دفعہ چھپی اور ملک نے قدر دانی کی تو میں نے رسالہ 'ازاحتہ الاغلاط' کو چھپوایا۔

یہ حقیقت ہے کہ جذبات انسانی، مناظر قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سموئے جاتے ہیں دوسرے اصناف میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی میں وہ دلکشی اور فضا آفرینی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے اس کے سحر میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ مثنوی میں جو داستانی رنگ ہوتا ہے وہ بھی متاثر کرتا ہے اور کردار، مناظر اور حسن و عشق کی روداد اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ قارئین شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ شوق نیموی کی مثنوی 'نغمہ راز' میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔ اس مثنوی کی ایک اور خصوصیت اس کا فطری آہنگ بھی ہے۔ حسن و عشق کی یہ وہ داستان ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اس مثنوی کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

تیری محفل کو سلام اے ساقی — اب اوٹھا شیشہ و جام اے ساقی
جوش پر آپ ہے میخانۂ دل — غم سے لبریز ہے پیانہ دل
ہے مجھے خون جگر جائے شراب — آتش غم سے میرا دل ہے کباب
رنج سے حال مرا ہے اب تر — منہ کو آتے ہیں مرے لخت جگر
تا کجا مرثیہ خوانی میری — ہو چکی سوز بیانی میری

پروفیسر وہاب اشرفی 'تاریخ ادب اردو' میں لکھتے ہیں:

> ''نیموی وجود و شہود دونوں میں حقیقتوں کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی عاشق و معشوق کے حوالے سے فراق و وصل کے اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں وجود حقیقی کی تلاش مضمر ہے اور ایک تازگی کے ساتھ نازک خیالی زبان کی سادگی اور شگفتگی محسوس کی جا سکتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو، ص 417)

دیوانِ شوق:

شوق نیموی باکمال شاعر تھے۔ اُن کا کمال فن اُن کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ وہ بہت کم عمری سے شعر کہہ رہے تھے۔ غازی پور اور لکھنؤ میں جب وہ زیر تعلیم تھے، موزوں اشعار کہنے

لگے تھے۔ طالب علمی ہی میں لکھنؤ کے اچھے شعرا میں شمار ہونے لگے تھے لیکن زبان اصلاح اور مذہبی کتابوں کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی وجہ سے اشعار کم کہے۔ 94 غزلیں جو 'یادگار وطن' میں شامل کی ہیں وہ اُن کا اپنا انتخاب ہے۔ باقی غزلیں انھوں نے ضائع کر دیں البتہ محمو نورالہدیٰ نیموی نے تلاش و جستجو کے بعد 128 صفحات پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا جس کا نام 'دیوان شوق' ہے۔ 1226 ہجری میں یہ دیوان شائع ہوا۔ ان میں غزلوں کی تعداد 94، قصائد کی تعداد 8، رباعیات کی تعداد 38 اور قطعات کی تعداد 26 ہیں۔ غزلوں کی یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں لیکن شوق نیموی کے مذاق سخن کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

حسن و عشق اُردو غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ شوق نیموی نے بھی حسن و عشق کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مزاج اُن کا بہت نازک ہے اے شوق
سمجھ کر نالہ و فریاد کرنا

بے چین ہم ادھر ہیں اُدھر بے قرار وہ
عاشق مزاج شوق ہمیں دلربا ملا

جو چلمن اُس نے اُٹھائی تو میں سنبھل نہ سکا
گرا تو اُٹھ نہ سکا اور اُٹھا تو چل نہ سکا

شوق نیموی عام واقعات کو عام زبان میں ڈھالنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں بے ساختگی کا رنگ ہے۔ بے لاگ انداز ہے۔ زبان کی صفائی ہے۔ چاہے عشقیہ اشعار ہوں یا صوفیانہ۔ اُن کے یہاں ایک اعتدال ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کے موضوعات عام زندگی سے اخذ کیا اور عام زبان میں شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ اس لیے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ خاک قبر پے آئے گا فاتحے کو مرے
جو دو قدم بھی جنازے کے ساتھ چل نہ سکا

خدا بچائے تمہاری نشیلی آنکھوں سے
کہ اک نظر جسے دیکھا پھر سنبھل نہ سکا

چمن میں جو گلچیں نے کچھ پھول توڑے
تو یاد آ گیا دل دکھانا کسی کا

شوق نیموی کا عہد کلاسیکی شاعری کا عہد تھا۔ اس لیے اُن کی شاعری میں کلاسیکیت بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے لیکن انداز اتنا سادہ ہے کہ پڑھنے والا گمراہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی علامت اور استعارے کے گورکھ دھندے میں پھنستا ہے۔ غزل کا مطلع سے مقطع تک ہر اشعار بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اُوپر جو تین اشعار میں نے درج کیے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کی رسائی نہ ہو سکے۔ پہلے شعر میں شکایت کا لہجہ ہے، دوسرے شعر میں محبوب کی نشیلی آنکھوں کی تعریف ہے اور تیسرے شعر میں پھول توڑنے پر دل کے دکھنے کا درد ہے۔ ظاہر ہے شاعر حساس ہوتا ہے۔ کبھی وہ کسی سے شکایت بھی کرتا ہے اور کبھی اُس کا دل روتا بھی ہے۔

شوق نیموی کی غزلوں کا موضوع عشق مزاجی اور عشق حقیقی دونوں ہے۔ وہ اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی وہ محبوب کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں اور کبھی اُس کے سراپا کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ سراپا نگاری کے علاوہ معاملات عشق کا بیان بھی اُن کی غزلوں میں نظر آتا ہے اور وصل و فراق کی کیفیت بھی بیان ہوتی نظر آتی ہے۔

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا
ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا
دل کوئی چرا لے تو نہیں اُس کی شکایت
آنکھیں مگر اے جان چرانا نہیں اچھا

اُس نے جب چلمن اُٹھائی بزم میں بجلی گری
رقص بسمل بن گئی ارباب محفل کی طرف

ہے تعجب کہ آپ نے اے شوق
کس طرح ہجر کی گذاری رات

ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شوق نیموی کے یہاں عشقیہ جذبات زیادہ ہیں لیکن عشق مزاجی کے ساتھ عشق حقیقی کا رنگ بھی اُن کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ کلاسیکی شعرا کے یہاں یہ دونوں رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ظاہر ہے شوق نیموی کلاسکل شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور صوفیانہ زندگی گزاری ہے لہٰذا اُن کی غزلوں کے چند اشعار میں عشق حقیقی کا عکس نظر آتا ہے۔ شوق نیموی نے فلسفۂ تصوف کی اصطلاحوں کا بھرپور استعمال کیا ہے اور حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

دل میں ہے یاد تیری آنکھوں میں نور تیرا
جس گھر میں جا کے دیکھا پایا ظہور تیرا
جلوہ ترا عیاں ہے پست و بلند سب میں
پھولوں میں بو ہے تیری تاروں میں نور تیرا

شوق نیموی کی شاعری میں عشق کا جو تصور ہے وہ عاشق کے سامنے خودسپردگی کا ہے لیکن کچھ اشعار میں اُن کی انانیت بھی نظر آتی ہے۔ وہ محبوب کے سامنے ایک عاشق کی طرح ہی سامنے آتے ہیں۔ اُن کے دل میں جو جذبۂ عشق ہے۔ محبوب کو ظاہری طور پر دکھانے کا نہیں ہے بلکہ دل پذیری کی کیفیت کی غماز ہے۔ اُن کے یہاں آہ و گریازاری کے مضامین زیادہ ہیں۔ شوق نیموی عشق میں آہ بھی کرتے ہیں، روتے بھی ہیں اور گریہ وزاری بھی کرتے ہیں لیکن وہ انداز نہیں جو میر تقی میر کا ہے۔

دیکھ لینا جو آہ کر بیٹھے
ہم بلا لیں گے اُن کو گھر بیٹھے

ہائے کیا وقت ہے تھمتے نہیں آنسو اپنے
اور وہ کہتے ہیں حال دل مضطر کہیے

آنسو اوبل کے آنکھوں میں پھر خشک ہو گئے
اس مدّ و جزر نے مری کشتی تباہ کی

شوق نیموی نے معشوق کی ناز وادا، حسن کے مرقعے، جسم کی رنگت، قد و قامت، اُس کا بننا سنورنا، اُس کی انگڑائیاں، لب و رخسار، زلفوں کے پیچ وخم، آنکھوں کی مئے کشی، بل کھا کر چلنا، نازک ادا، لباس، قاتلانہ انداز، چلمن کی اوٹ سے جھانکنا، شرم و حیا کی مورت، سرگی جادوئی آنکھیں، نگاہ ناز سے جلا دینا، پھولوں سی شوخی، حشر اٹھانے والا انداز، سب کچھ دیکھتے ہیں اور اپنے محبوب کی مرقعہ سازی کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کا معشوق گوشت پوست کا پیکر نظر آتا ہے۔ اُن کا معشوق خیالی نہیں، حقیقی ہے۔ جسے ہم دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اسے چھو کر دیکھتے ہیں۔ اس کے جذبات و احساسات کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ جیتا جاگتا وجود ہے، تصوراتی نہیں۔

گری بجلی غضب کی پرتو رخسار روشن ہے
جو وہ پردہ نشیں گل روزن دیوار سے جھانکا

گلوں کا جوش بہار چمن نہ پھر یاد آتے
جو دیکھ لے کہیں بُلبُل ترے بدن کی رنگت

ایسا نہیں ہے کہ شوق نیموی نے صرف کلاسیکی روایت کی پاسداری کی ہے بلکہ نئے الفاظ، نئے تراکیب اور نئے ردیف کا بھی استعمال کیا ہے اور یہی خصوصیت انھیں اُس عہد کے شاعروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ نئے الفاظ کو برتنے میں بھی فن کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔

کب ہے ممکن عشق صادق کا علاج
کہتے ہیں سب اُس مرض کو لاعلاج

کچھ ایسی اے دل آہ پر اثر کھینچ
چلے ہیں غیر کے گھر وہ ادھر کھینچ

ان دونوں غزلوں میں الفاظ کی ترکیب بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ پہلی غزل میں محبت کا مرض لاعلاج ہونا، قتل بسمل سب سے اچھا علاج ہونا، مسیح سے درد دل کا علاج پوچھنا، مریض عشق کا اُلٹی پلٹی دوا، اُلٹا علاج ہونا، ناصح کا اپنا علاج کرنے کا مشورہ، چارہ گر سے یہ کہنا کہ شربت دیدار ہی اس کا علاج ہے۔ اس غزل کو پڑھ کر لگتا ہے کہ دور جدید میں یہ غزل لکھی گئی ہے۔ وہیں دوسری غزل جس کا ردیف کھینچ ہے، اس میں بھی بھرپور جدّت ہے۔ پوری غزل میں جدید ترکیب کا استعمال کیا ہے۔ معراج اُلفت، آشفتہ پریشاں، ہاتھ درماں، عاشقوں کو دار پر کھینچنا، قد جاناں، لحد پر سائباں، حسینوں سے اُلفت کرنے کا خمیازہ، آہ ہنگامے سحر، نازک مزاج دلربا وغیرہ۔

ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ شوق نیموی کے یہاں جو موضوعات ہیں جو لہجہ ہے، جو ترکیبیں ہیں، وہ انھیں اپنے ہمعصر میں منفرد بناتے ہیں۔ اُن کا رنگ اساتذہ سخن کا رنگ ہے لیکن اس رنگ و آہنگ میں انھوں نے اپنا رنگ بھی گھول دیا ہے۔ اس لیے روایت کے ساتھ ساتھ جدید رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔

شوق نیموی کی غزلوں میں سادگی، صفائی اور سلاست موجود ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین نہیں بلکہ بعد کے شعرا میں بھی ممتاز ہیں۔

گریباں آستیں دامن سے کیا کام
تیرے وحشی کو پیراہن سے کیا کام
ملاؤگے گلے خنجر کو شاید
تمہیں ورنہ رگِ گردن سے کیا کام

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق نیموی کی فکر روشن بھی ہے اور دلکش بھی۔ ان کے یہاں جذبات اور تخیلات ایک جاں دو قالب ہوجاتے ہیں۔ وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ اپنے اشعار میں ایک اثر اور کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

سینے میں ہوک اٹھی ہے پہلو ہے داغ دار
دل دے کے آپ کو مجھ کو اچھا صلا ملا
سرگشتہ صبح و شام تھے جس کی تلاش میں
آخرکو اس کا گوشۂ دل میں پتا ملا

شوق نیموی روایتی غزل کے شاعر ہیں لیکن گھسے پٹے انداز میں شاعری نہیں کی بلکہ اپنے نئے انداز کی وجہ سے ہی وہ مشہور ہوئے اور اپنے انوکھے تیور سے متاثر کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو غزل زندگی کی کشاکش سے دور رہی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ بہت سارے شاعروں نے زندگی کے مسائل کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ شوق نیموی کے یہاں بھی کئی ایسی غزلیں مل جاتی ہیں۔

کبھی کہیں کی کبھی کی یہاں وہاں کی بات
نکالی حضرت ناصح نے بھی کہاں کی بات
ہزار شمع سر بزم رو کے کہتی ہے
کسی کے فہم میں کیا آئے بے زباں کی بات

شوق نیموی بہر کیف غزل کے شاعر ہیں اور اپنے صوفیانہ مزاج کو کبھی غزل پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے جذبات و احساسات میں ایک ندرت ہے جو انھیں ایک اہم شاعر بناتا ہے۔ وہ محاورات اور تشبیہات کا استعمال بہت کم کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پڑھنے میں ان کے اشعار سپاٹ اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں لیکن انھوں نے غزل کے فن کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ لکھنؤ کی زندگی اور پھر پٹنہ میں قیام کے دوران انھوں نے جو شاعری کی اور جو زندگی انھوں نے جی ان سب کا اثر ان کی غزلوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ کبھی کسی ازم کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اپنا ایک مزاج اور معیار قائم کیا اور اسی پر آخری وقت تک

چلتے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شوق نیموی کی مقبولیت مثنوی 'سوز و گداز' سے ہے لیکن غزلوں میں بھی فن کو ملحوظ رکھا۔ ان کی غزلوں میں سادگی، سلاست، برجستگی اور روانی ہے۔ انھوں نے بے ریا زندگی گزاری اور فطری انداز میں غزل کے اشعار کہے جو انھیں مقبول بناتا ہے۔

O

شوق نیموی کی رباعیات

دوسری اصناف سخن کی طرح رباعی بھی فارسی سے اردو میں آئی ہے لیکن اردو میں رباعی کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق ہے جبکہ تمام نامور شعرا نے رباعیاں کہی ہیں لیکن غزل کی طرح اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی گئی۔ خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا، میر انیس، مرزا دبیر، مرزا غالب، ذوق، شاد عظیم آبادی، الطاف حسین حالی، یاس یگانہ چنگیزی، اکبرالہ آبادی، امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی وغیرہ نے رباعیاں کہی ہیں، اور رباعی کے فن کو ملحوظ رکھ کر کہی ہیں۔ فرمان فتح پوری رباعی کے فن پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''رباعی کے چار مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے۔ پہلے مصرعے میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشن کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خط و خال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہو کر رہ جائے۔'' (اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقا، ص 20)

غور طلب ہے کہ کچھ ہی شعرا نے اس صنف پر خاص توجہ کی جیسے جوش ملیح آبادی کی رباعیوں کے دو مجموعے 'جنون و حکمت' اور 'نجوم و جواہر' شائع ہوئے۔ فراق گورکھپوری کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ'، جاں نثار اختر کی رباعیوں کا مجموعہ 'گھر آنگن' اور امجد حیدرآبادی کی رباعیوں کا مجموعہ 'رباعیات امجد' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان شاعروں کے علاوہ یگانہ چنگیزی، افق لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، فانی بدایونی اور دوسرے کئی شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں۔ رباعی کہنے والوں میں ایک نام شوق نیموی کا بھی ہے۔ شوق نیموی نے حالانکہ کم

رباعیاں کہی ہیں لیکن تعداد جتنی بھی ہو ان کی رباعیاں متاثر کرتی ہے۔

ایمان کا پاس کچھ خدا کا بھی ہے دھیان — کعبہ کو بنا دیا بتوں کا استھان
کیا شوق چلے ہو وعظ کہنے کے لیے — دل میں یاد بتاں بغل میں قرآن

شوق نیموی کی رباعیاں فکرانگیز و بصیرت افروز ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔

ہوتا ہے اب ذکر خدائے برتر — کالج یہ نہیں آج خدا کا ہے گھر
ثابت ہے کلام نبوی سے اے شوق — رحمت کے فرشتوں نے بچھائے ہیں پر

اے گردش چرخ نے کیا کام تمام — غفلت میں پڑی رہتی ہے قوم اپنی مدام
اے خواب گراں کہ سونے والو اٹھو — اب نام کو رہ گیا ہے باقی اسلام

شوق نیموی نے کچھ روایتی مضامین کو اپنی رباعیوں میں اپنا کر انھیں اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں تازگی، جدّت اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔

یہ کیا کہ رقیب ہی کے محفل میں رہو — اے غیرت ماہ اپنی منزل میں رہو
تم نور نگاہ آرزو ہو مرے — آنکھوں کبھی رہو کبھی دل میں رہو

شوق نیموی متقی اور پرہیزگار شخصیت کا نام ہے۔ تصوف، قناعت، متانت، پرہیزگاری اور سادگی ان کے مزاج کا اہم جز ہے۔ اپنی رباعیوں میں بھی اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی اور انسانی قدروں کی پاسداری کی۔

افسوس وہ اسلام کی حالت نہ رہی — وہ شکل وہ رنگ اور صورت نہ رہی
غفلت کے مرض سے ہوگئے دل کمزور — اسلام کے کچھ کام کی ہمت نہ رہی

شوق نیموی کی رباعیاں مذہب، اخلاق، مذہبی رواداری، عصری زندگی کی جھلکیاں، سماجی حالات کا عکس، قوم کی زبوں حالی کی عکاس ہیں۔ وہ عام زندگی کے مسائل کو سادگی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سیدھے دل میں اتر جاتا ہے۔ شوق نیموی نے اپنی رباعیوں میں اخلاقیات کی بھی تعلیم دی ہیں۔

گو چرخ کے پامال ستم ہیں ہم لوگ صد شکر مگر اہلِ ہمم ہیں ہم لوگ
اے شوق کسی سے نہیں دبنے والے کس فن میں کسی غیر سے کم ہیں ہم لوگ

شوق نیموی کی رباعیوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے خیالات کو رباعی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے جبکہ اکثر رباعیوں میں یکسانیت ہوتی ہے لیکن ان کے یہاں وسعت بھی ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ ان میں وہ تاثیر ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ غزل کی طرح شوق نیموی نے رباعیوں میں بھی اپنے فن کے عروج پر نظر آتے ہیں۔

شوق نیموی کی چند مشہور رباعیات یہاں پیش کرنا چاہوں گا تا کہ بخوبی اندازہ ہو سکے کہ غزل کی طرح رباعی میں بھی وہ ماہر فن تھے:

آیا ہے جو وفد ندوۂ ذی شوکت چھائی ہوئی ہے کیسی خدا کی رحمت
گھر بیٹھے مراد ہم نے پائی اے شوق اللہ اللہ یہ ہماری قسمت

اس کعبۂ دل میں جو خدا کا ہے مکان افسوس کہ رہتا ہے بتوں کا ارمان
اے شوق جو کچھ کہیے تو بول اٹھتا ہے تو مان نہ مان میں ہوں تیرا مہمان

اشعار مرے نہیں یہ ہیں نالہ و آہ پتھر کے دل میں بھی یہ کرتے ہیں راہ
اے شوق یہ اعجاز ہے گویائی کا بول اٹھتے ہیں سبحان اللہ

اے شوق یہ چہرے کا اوترنا کیسا رہ رہ کے کسی کو یاد کرنا کیسا
مانا کہ کوئی اور سبب اس کا ہے لیکن یہ سرد آہ بھرنا کیسا

گھائل جو ہوں تیغ ابرو دلبر کا ہر لفظ میں رنگ ہے دم خنجر کا
ٹوٹے ہوئے دل سے جو صدا نکلے گی اے شوق کرتے گی کام وہ نشتر کا

شوق نیموی کے قصیدے

قصیدہ ہماری کلاسکی شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ قصیدہ نہ صرف ہمارے شعری ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے بلکہ اپنی ادبی شان، انداز بیان، معاشرتی زندگی کی عکاسی اور اپنے مخصوص اجزائے ترکیبی کی وجہ سے صنف شاعری میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قصیدہ عربی اور فارسی میں بے حد مقبول صنف تسلیم کیا گیا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دور جاہلیت میں بھی لوگ تمنا کرتے تھے کہ فلاں شاعر کے قصیدے میں ہمارا بھی ذکر آجائے۔ ''خواتین چاہتی تھیں کہ شاعر قصیدے میں ہم سے تشبیب کرے۔ جاہلیت کے دو شاعر اعشیٰ اور نابغہ ذبیانی نے شاعری کو حصول زر اور جلب منفعت کا ذریعہ بنایا۔ یہیں سے انفرادی اور شخصی مدّاحی کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ فرمائشی قصیدے کہنے لگے۔ اعشیٰ نے ایک فرمائشی قصیدے میں ابن محلق کی تین بدصورت لڑکیوں کی ایسی تعریف کی کہ اچھے گھرانوں میں ان کی شادیاں ہوگئیں۔ ظہور اسلام کے بعد ابوسفیان نے اعشیٰ کو سو اونٹ دے کر پیغمبر اسلام کی ملاقات سے روک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ مبادا یہ مسلمان ہو جائے اور اپنی شاعری کے ذریعے عرب میں اسلام کی اشاعت کرے۔ بابغہ نے حاکم وقت نعمان کی بیوی متجردہ کا ایسا فرمایشی سراپا لکھا کہ نعمان کو متجردہ اور نابغہ کے تعلقات پر شک ہوگیا۔ نابغہ نے شاعری کو تجارت سمجھ لیا تھا۔ اس لیے اچھا شاعر ہونے کے باوجود وہ جاہلیت کا سب سے بدنام شاعر ہے۔''

(بحوالہ: الانوار المنتخبہ، العمدہ، جلد اوّل اور کتاب الشعر والشعرا)

قصیدہ کے ابتدائی نمونے ہمیں دکن میں ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں سودا نے قصیدہ کو بام

عروج پر پہنچا دیا۔ سودا کے بعد غالب، مومن، ذوق نے سودا کی ہمسری کی۔ اس کے بعد محسن کاکوروی اور دوسرے شعرا نے بھی اس کو فروغ دیا۔ اسی میں ایک نام شوق نیموی کا بھی ہے۔ انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں قصیدے کہے۔ اردو میں ایک نعتیہ قصیدہ ملتا ہے۔ قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اللہ رے یہ جلوہ حسن و جمال عید
چمکا برنگ ابروئے خوباں ہلال عید

آنکھیں جو شام سلخ کو تھیں سوئے آسمان
کرتے تھے روزہ دار خدا سے سوال عید

وہ جابجا گھٹا وہ ہلال اور وہ نجوم
دیتے تھے لطف گیسو و ابرو وہ خال عید

آئی جو باغ دہر میں ناز و ادا کے ساتھ
ایام رنج و غم کے ہوئے پائمال عید

شوق نیموی کے قصیدوں میں تشبیب، گریز، مدح، الفاظ و تراکیب اور تخیل کی بلند پروازی ہے۔ انھوں نے قصیدے کے فن کو ملحوظ رکھا ہے اور روایت کی پاسداری کی ہے۔ ان کی زبان سادہ وسلیس ہے۔ وہ بہت آسان لفظوں میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادی کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے 37 اشعار پر مشتمل ہے جس کا عنوان ہے 'حضرت مولانا فصل رحمٰن گنج مرادی کی شان میں'۔ وہ قصیدہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

برنگ بو مری قسمت میں لکھی تھی جو عریانی
جنوں نے مجھ کو بخشی مثل گل صد چاک دامانی

پھرا کرتا ہوں میں وحشت زدہ دن رات صحرا میں
فلک کی طرح گردش ہے نہیں ممکن تن آسانی

کبھی سر پر بگولے ہیں کبھی شاخیں ببولوں کی
یہ زریں سائباں ہیں اور وہ چتر سلیمانی

شکست رنگ عارض نے جو رنگ اپنا جمایا ہے
برستی ہے مرے دیوار تن سے آج ویرانی

مدح قصیدہ کا اصل مقصد ہے۔ مدح کا ممدوح کی حیثیت و مناسبت رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ممدوح کی نفسیات سے نہ صرف آگاہ ہو بلکہ ان کے مزاج سے بھی آشنا ہو۔ ان کے علم، حالات زندگی، مذہبی رجحان، عقل و حکمت سبھی سے واقفیت رکھتا ہو اور جب اس کی تعریف کرے تو مبالغے کا پہلو شامل نہ ہو۔ اس قصیدے میں بھی شوق نیموی نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے۔

بنایا ہے خدا نے دل مرا گنجینہ حکمت
مری نظروں میں ہے شکل بدیہی علم یونانی

مرا دست کرم رکتا نہیں ایثار سے دم بھر
لٹاتا ہوں ہمیشہ گوہر اسرار فرقانی

حدیث مصطفٰے سے ہے دہن پیمانۂ کوثر
زبان تر مری ہے موج بحر فقہ نعمانی

مرے نور یقیں سے ہے شبستان جہاں روشن
برنگ شمع کافوری سراپا دل ہے نورانی

شوق نیموی کے اس قصیدہ میں نغمگی، ترنم اور روانی ہے۔ آہنگ کا ایک ایسا جادو ہے جس میں پڑھنے والا کھو جاتا ہے۔ وہ نہ مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں نہ ہی ایسی تراکیب کو اپناتے ہیں کہ پڑھنے میں مشکل درپیش آئے۔ زبان میں شستگی اور صفائی ان کے قصیدے کے وقار کو بلند کرتا ہے۔ آخر کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

ادب سے آئیں رحمت کے فرشتے میری محفل میں
کہ میں کرتا ہوں اپنے پیر و مرشد کی ثناخوانی

امنگوں پر طبیعت ہے سناتا ہوں میں وہ مطلع
کہ سنتے ہی پھڑک اٹھے لحد میں روح خاقانی

'مطلع ثانی' کے عنوان سے اپنے پیر و مرشد کی مدح میں ایک دوسرا قصیدہ بھی شوق نیموی نے لکھا ہے اور اس میں بھی ان کی شخصیت، عالمانہ خصائص، بزرگانہ فضائل اور حسن سیرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ پہلے دو اشعار میں اپنے پیر و مرشد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

جناب فضل رحمٰن پر ہوا جب فضل رحمانی
دل اقدس بنا آئینہ اسرار ربانی

خدا نے آپ کو آئینہ قدرت بنایا ہے
نظر آتی ہے جس میں شان حسن صنع یزدانی

بعد کے اشعار میں ممدوح کے تمام اوصاف حمیدہ اور جاہ و جلال کا ذکر بیحد شاعرانہ انداز میں شوق نیموی کرتے ہیں لیکن کہیں بھی زبان و بیان مجروح ہوتا نظر نہیں آتا ہے:

ہوئے سیراب لاکھوں اک نگاہ لطف پرور سے
پلائے سینکڑوں پیاسوں کو اپنے جام عرفانی

مگر میں خوبی قسمت سے اب تک رہ گیا پیاسا
نہ بخشا مجھ کو خضر معرفت نے آب حیوانی

شوق نیموی نے قصیدہ 'نواب منگرول کی شان میں' بھی لکھا ہے جس میں 46 اشعار ہیں۔ اس قصیدہ میں الفاظ کی متانت، بندش کی چستی، خیالات کی نزاکت، الفاظ کا بہاؤ موجود ہے۔

مجکو خلاق معانی نے دیا ہے وہ کمال
نکلے جو بات مرے منہ سے وہ سحر حلال

عرش پرواز ہے شہباز تفکر میرا
لامکاں دم میں پہنچتا ہے مرا مرغ خیال

شوق نیموی نے ایک قصیدہ نواب ڈھاکہ کی شان میں بھی لکھا ہے جس میں 34 اشعار ہیں۔ اس قصیدہ کا آغاز روایتی انداز سے کرتے ہیں۔ پہلے مناظر قدرت کا نقشہ کھینچتے ہیں:

گیا جو آج میں سیر چمن کو وقت سحر
نسیم صبح گلے ملنے آئی خوش ہوکر
اٹھا کے آنکھ جو میں نے ادھرادھر دیکھا
ہرا بھرا نظر آیا مجھے چمن یکسر
عروس باغ نے پہنے تھے پھولوں کے گہنے
گل و سمن تھے طلائی و نقرئی زیور

نواب رام پور کلب علی خاں نے جب شوق نیموی کو رام پور بلایا اور وہ وہاں پہنچے تو ان کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا عنوان ہے 'نواب رامپور کلب علی خاں کی شان میں'۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لکھوں میں اگر اک صفت لاکھ کے بدلے ہو جزو قصیدہ مرا دفتر سے زیادہ
اے شوق شب و روز پے حضرت ممدوح کر عرضی یہی خالق اکبر سے زیادہ
یارب مرے سلطان کو صحبت رہے حاصل ہو عمر عطا خضر پیمبر سے زیادہ
ہو دیدۂ بدبیں کے لیے جنبش مژگاں ہنگامہ نظر کاوشِ نشتر سے زیادہ
اقبال و حشم دیکھ کے حاسد تہہ افلاک جلتے رہیں دن رات سمندر سے زیادہ

قصیدہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں خطابیہ اور تمہیدیہ۔ خطابیہ قصیدہ وہ ہے جس میں شاعر تمہید باندھے بغیر مدعا بیان کردے۔ مطلب یہ کہ اگر قصیدہ مدحیہ ہے تو شاعر ممدوح کو خطاب کرے اور اس کے اوصاف کو بیان کرنا شروع کردے۔ شوق نیموی نے اپنے پیر و مرشد کے لیے جو قصیدے لکھے ہیں وہ خطابیہ ہیں۔ نواب ڈھاکہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے وہ تمہیدیہ ہے۔

تمہید یہ قصیدہ اسے کہتے ہیں جس میں اصل مدعا سے پہلے تمہید باندھی جائے پھر مدعا بیان کیا جائے۔ یہ تمہید تشبیب کہلاتی ہے۔ اس قصیدہ کے شروع کے چند اشعار میں مناظر قدرت کا نقشہ بہت ہی خوبصورت انداز سے کھینچا ہے اور قصیدہ کے آخر میں مدعا بیان کیا ہے۔

شوق نیموی نے حالانکہ بہت کم قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے قصیدہ کے فن کو بخوبی سمجھا ہے اور اس کا نباہ بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں نغمگی اور روانی ہے۔ اور جس کی وہ مدح سرائی کی ہے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان کی شخصیت اور اوصاف کو ہو بہو پیش کیا ہے۔

O

شوق نیموی کے قطعات

ایسے کچھ اشعار کا مجموعہ جن میں کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے قطعہ کہلاتا ہے۔ضروری نہیں کہ غزل اور قصیدے کی طرح قطعے کا پہلا شعر مطلع ہو۔ قطعے میں دو یا دو سے زیادہ اشعار ہو سکتے ہیں لیکن اس کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ قطعہ اور غزل مسلسل کو ایک ہی چیز سمجھنا غلط ہے۔غزل مسلسل میں مطلع ہونا ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ غزل مسلسل کے اشعار میں تسلسل کے باوجود ہر شعر کا مضمون کسی نہ کسی درجے میں مکمل ہو جاتا ہے جبکہ قطعے میں مضمون ایک شعر سے دوسرے شعر میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔

اردو میں قطعہ کافی مقبول رہا ہے اور بہت سے شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے، ان میں الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، شبلی نعمانی، ظفر علی خاں اور اختر انصاری کا نام لیا جاسکتا ہے۔

شوق نیموی نے بھی قطعات کہے ہیں جو اردو اور فارسی میں موجود ہیں۔ یہ قطعات کچھ تو مشاہیر کی وفات پر ہیں یا دیوان وکلیات کی طباعت پر۔ حالانکہ انھوں نے کم ہی قطعات کہے ہیں لیکن ان کے قطعات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو فن کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ دیوان آغا حسین ازل لکھنوی کی طباعت کے موقع پر جو قطعات کہے ہیں وہ یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔

مبارک باد اے ارباب معنی — یہ دیوان حکیم آغا حسن ہے
تخلص ہے ازل مشہور عالم — زمانے جس کا مشتاق سخن ہے
زبان اچھی کلام اچھا نہ ہو کیوں — کہ شہر لکھنؤ ان کا وطن ہے
عجب دلکش ہے یہ گلزار رنگیں — کہ رشک لالہ و سرو و سمن ہے
بیان حال درد لذت آگئیں — نوائے طوطی شکر شکن ہے

جوا ہے بیز ہے ہر شعر نایاب ہر اک نقطہ مگر در عدن ہے
سواد خط ہے شام لیلۃ القدر بیاض ہر ورق صبح چمن ہے
معطر ہے مشام نقطہ سنجاں مداد عنبریں مشک ختن ہے
فروغ پر تو مہر سخن ہے خط جدول کہ سورج کی کرن ہے
بھرے ہیں زیور حسن معانی مرصع نظم ہے یہ یا دلہن ہے
یہ لکھو مصرعہ تاریخ اے شوق پسند خاطر ہر اہل فن ہے

1312ھ

سورج بھان میکش حیدرآبادی کے دیوان دوم کی طباعت پر بھی شوق نیموی نے قطعہ کہا جو یہ ہے:

شفیق شوق سورج بھان میکش درخشاں آفتاب نکتہ دانی
نشاط افزائے بزم بذلہ سنجاں قدح نوش مئے شیریں زبانی
گل رنگیں گلزار فصاحت بہار افروز باغ خوش بیانی
ہوا دیوان دوم ان کا جب جمع پسند خاطر اہل معانی
یہ لکھا مصرع تاریخ میں نے ہے واں رتبہ کا دیوان ثانی

1311ھ

اس کے علاوہ سید نذرالرحمٰن حفیظ عظیم آبادی کے دیوان کی طباعت پر قطعہ کہا۔ منشی نعیم الحسن مشیر کی مثنوی کی طباعت پر جو تاریخی قطعہ کہا ہے وہ یہ ہے:

مثنوی کیا مشیر نے لکھی کھینچی ہے حسن و عشق کی تصویر
ہے حسینوں کو جان سے مرغوب دل سے بھاتی ہے نظم پر تاثیر
چوٹ کھائے ہوئے دلوں کے لیے نوک نشتر اسے کہوں یا تیر
اس کی طرز بیاں ہے سب کو پسند ہوں حسن یا نسیم یا ہوں میر
شوق لکھو یہ مصرعہ تاریخ ہے پسندیدہ مثنوی مشیر

1306ھ

ممتاز احمد ممتاز تھانوی کے نعتیہ دیوان کی طباعت پر بھی ایک تاریخی قطعہ شوق نیموی نے کہا جسے بہت پسند کیا گیا۔

نہ کیوں مقبول عالم ہو یہ دیوان　　گل نعت رسول انس و جاں ہے
مشام قدسیاں تک ہے معطر　　یہ وہ مجموعہ عنبر فشاں ہے
ڈھلا ہے نور کے سانچے میں ہر شعر　　عجب حسن معانی و بیاں ہے
غضب کے ہیں اشارات و کنایات　　سمجھتا ہے وہی جو نکتہ داں ہے
کہی اے شوق میں نے اس کی تاریخ　　کلام شاعر شیریں زباں ہے

1307ھ

رباعی کی طرح قطعہ میں بھی شوق نیموی نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے اور اس صنف کو وہ مقام عطا کیا کہ پڑھنے والا شوق نیموی کو قطعہ کا ماہر سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

○

شوق نیموی کی مذہبی تصنیفات

شوق نیموی نے علم دین کی تحصیل کے لیے پٹنہ، غازی پور اور آخر میں لکھنؤ تک گئے۔ اس دور کے جید علما سے دین کی تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں لکھنے کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی کتابیں طالب علمی کے زمانے میں ہی منظر عام پر آ گئیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان کے لکھنے کا ذوق کم نہیں ہوا اور آخر وقت تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اس طرح ان کی گیارہ مذہبی تصنیفات منظر عام پر آئیں۔

آثار السنن

'آثار السنن' فن حدیث کی کتاب ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس وقت کے اکابرین اور مشائخ علما کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ہندوستان کے مشہور عالم مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے اپنی تصنیفات میں کثرت سے شوق نیموی کی تحقیقات تحریر کیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب 'اعلاء السنن' میں جابجا شوق نیموی کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ شیخ الحدیث مولانا ذکریا سہارنپوری نے جب موطا امام مالک کی شرح 'اوجز المسالک' لکھی تو شوق نیموی کی تحریروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا۔ اسی طرح مولانا حکیم عبدالحئی لکھنوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، اور شیخ عبدالحق مہاجر مکی جیسے ماہرین علم حدیث کو انھوں نے اپنی تبحر علمی کا معترف کیا لیکن ان کے علاوہ علامہ انور پاشا کشمیری نے اعتراف کیا کہ ''تین سو برس سے ہندوستان میں اس پایہ کا محدث پیدا نہیں ہوا۔'' (ہندوستانی مسلمان، ص 50)

'آثار السنن' کے بارے میں حذیفہ شکیل نے بہت اچھی بات لکھی ہے:

''فن حدیث میں لکھی گئی ان کی تصنیف 'آثارالسنن' کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب کے مابہ الامتیاز پر اگر ہم غور کریں تو اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ نظر آتا ہے کہ علامہ شوق نیموی کا تحقیقی رنگ اس میں نمایاں ہے اور اسے پڑھ کر ان کی گراں قدر تحقیقات بلکہ ان کے صاحب رائے ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ متن کتاب میں 47 اور تعلیقات کی شمولیت کے ساتھ 150 مقامات پر علامہ شوق نیموی نے مضبوط دلائل کی روشنی میں 'قال النیموی' کے ذریعہ اپنی رائے کا برملا اظہار کیا ہے اور ایسی نادر تحقیقات پیش کی ہیں جس پر متقدمین و متاخرین علما کی زبانیں خاموش نظر آتی ہیں۔ گویا اس زاویے سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی بعض تحقیقات میں موجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یقیناً یہ ان کی علمی صلاحیت کی واضح دلیل ہے۔ اور اس کتاب کی عظمت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ علامہ شوق نیموی کی 'آثارالسنن' آج بھی مختلف مدارس اور دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر میں داخل نصاب ہے اور ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں بھی نصاب کا حصہ رہی ہے۔'' (مضمون علامہ شوق نیموی، حذیفہ شکیل، ص 4)

'آثارالسنن' شوق نیموی کی وہ کتاب ہے جو ان کو مقبولیت کی بلندی تک پہنچا دیا۔ اس کتاب کی تالیف کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں: 'آثار السنن' نام ایک کتاب کی بنائے تالیف ڈالی ہے جس کے لیے بلاد مختصر خصوصاً مصر و روم و حرمین شریفین کا سفر درکار ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ اگر یہ کتاب تیار ہوگئی تو انشاء اللہ تعالیٰ حنفیہ کے لیے نہایت کارآمد ہوگی۔ حضرت واہب العطایا کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ فن حدیث میں جس کا شوق مجھ کو زیادہ ہے قلمی کتابیں ایسی ہاتھ آگئی ہیں جو ہندوستان کیا عرب میں بھی کمیاب ہیں۔''

اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے وہ حنفی علما جو فن حدیث میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت، باوقار اور مستند سمجھے جاتے تھے، انھوں نے بھی اس کی طباعت پر نہ صرف اظہار مسرت کیا بلکہ اپنی اپنی تصنیفات و تالیفات میں قال النیموی یا قال العلامہ نیموی کہہ کر جابجا

علامہ نیموی کی تحقیقات کے حوالے پیش کیے۔" (علامہ شوق نیموی : حیات وخدمات، عتیق الرحمٰن قاسمی، ص 262)

حدیث خصوصاً رجال میں ان کا جو مقام ہے، کوئی دوسرا نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے فن حدیث کے باب میں ان کی پذیرائی کی۔ علامہ انور شاہ کشمیری سے لے کر مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی اور مولانا زکریا سہارنپوری کے نام اہم ہیں۔

اس کے علاوہ شوق نیموی کی کئی اہم مذہبی کتابیں ہیں جس کی تفصیل یہاں پیش کر رہا ہوں۔

اوشحتہ الجید فی اثبات التقلید

اس کتاب میں تاریخ، فقہ اسلامی، ارتقا فقہ اسلامی اور تقلید پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ایک سو دس صفحات پر مشتمل قومی پریس لکھنؤ سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کی زبان اُردو ہے۔

جبل المتین

آمین بالجہر کے رد میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

رد السکین

مولانا سعید بنارسی نے 'السکین' لکھی 'جبل المتین' کے جواب میں۔ تو اس کے جواب میں علامہ شوق نیموی نے 'رد السکین' کے نام سے کتاب لکھی۔ 1312 ہجری میں قومی پریس لکھنؤ سے یہ کتاب شائع ہوئی۔

جامع الاثار فی اختصاص الجمعۃ بالامصاد

علما اہل حدیث نے گاؤں دیہات میں جمعہ کے جواز پر کتابیں لکھیں تو علامہ شوق نیموی نے اس کے جواب میں سولہ صفحات کا یہ رسالہ لکھا جو احسن المطابع، پٹنہ سے شائع ہوا۔

المقالمۃ الکاملہ

شیخ محمد علی اعظمی نے 'الاجوبۃ الفاخرۃ الفاضلۃ' لکھی جس میں حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت گنج مرادآبادی پر اعتراضات کیے۔ اس کے جواب میں شوق نیموی نے 69 صفحات کا یہ رسالہ لکھا جو 1308 ہجری میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

لامع الانوار

محمد علی اعظمی نے علامہ شوق نیموی کی کتاب 'جامع الآثار' کے رد میں 'المذہب المختار' نامی کتاب لکھی تو شوق نیموی نے اس کے جواب میں 86 صفحات کا یہ رسالہ مرتب فرمایا۔ یہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔

جلاء العین فی رفع الیدین

سولہ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں رفع الیدین کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔ قومی پریس لکھنؤ سے یہ رسالہ شائع ہوا۔

الدرۃ الفرۃ فی وضع الیدین علی الصدور و تحت السرۃ

چھ صفحات کے اس رسالہ میں وضع الیدین علی الصدور کی روایات جمع کرنے کے بعد ان پر جرح کی اور پھر صحیح احادیث سے وضع الیدین تحت السرۃ کو ثابت کیا۔

بیان التحقیق

پانچ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں شیخ نے اپنی قیمتی تحقیقات جمع کی اور 'آثار السنن' کی اشاعت سے پانچ سال پہلے اس کو شائع کیا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

تذئیل در بیان تقبیل

دو صفحات کے اس رسالہ میں علماء و صلحاء کی دست بوسی کے جواز اور فضیلت کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔

وسیلۃ العقبیٰ فی احوال المرضیٰ والموتیٰ

پچاس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مرض اور موت کی حقیقت اس پر صبر ادویات محرمہ اجتناب، انتقال روح عن الجسم، کیفیت سماع موتی، نوحہ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔

یہ تمام کتابیں عقاید سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں ہندوستان کے متعدد مدارس کے نصاب میں شامل ہیں اور کچھ کتابیں تو علما حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کچھ کتابیں تو ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں بھی نصاب میں شامل ہیں۔ شوق نیموی کی ہر تصنیف ان کی علمی، مذہبی مطالعہ کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ وہ ایک عظیم محدث، بے مثال محقق اور فقیہہ کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

O

ماحصل

شوق نیموی اردو کے ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی خدمات کو اردو زبان و ادب ہمیشہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ شوق نیموی 1860 صالح پور ضلع پٹنہ میں اپنی خالہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد سبحان علی صوفی اور عالم تھے۔ ان کے ذوق علم کا یہ عالم تھا کہ کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے پاس جمع کرتے یا دوسرے سے لکھوا کر محفوظ کر لیتے۔ انھوں نے 'شاہنامہ فردوسی'، 'دیوان حافظ'، 'قصہ حاتم طائی' اور 'دیوان جوشش' جیسی اہم کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کی تھیں۔

شوق نیموی کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا جہاں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شمس العلما مولانا حسرت عظیم آبادی کی خدمت سے فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد غازی پور چلے گئے جہاں مولانا مفتی محمد فرنگی محلی کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں ملک کے معروف عالم مولانا حافظ عبداللہ اور مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اس مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ شوق نیموی ان اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔

شوق نیموی کم عمری سے ہی شعر موزوں کر لیتے تھے۔ انھیں بیت بازی کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے بیت بازی کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

نامور اساتذہ کی محبت اور علمی و ادبی ماحول میں شوق نیموی کا ادبی ذوق پروان چڑھا بالخصوص شمشاد لکھنوی کی صحبت سے خوب فائدہ اُٹھایا۔

شوق نیموی طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ 1885 میں

'نغمۂ راز' مثنوی لکھی۔ اس کے علاوہ 'ازاحۃ الاغلاط' اور 'اصلاح' نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کو خوب پسند کیا گیا لیکن جلال لکھنوی جیسے شاعر نے ان پر سخت تنقیدیں لکھیں جن کی بنا پر جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے درمیان ادبی معرکہ چھڑ گیا۔ جب 'ازاحۃ الاغلاط' اور 'اصلاح' نام کی کتابیں منظرعام پر آئیں تو نواب رامپور کلب علی خاں نے ان کتابوں کی بہت تعریف کی اور انھیں رام پور بلایا۔ جب شوق نیموی رام پور گئے تو نواب کلب علی خاں نے ان کی خوب خاطر و مدارت کی۔ شوق نیموی نے ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ایک قصیدہ لکھا جو کافی پسند کیا گیا۔ نواب رام پور نے کافی نقد رقم دے کر انھیں رخصت کیا۔

جلال لکھنوی نے 'ازاحۃ الاغلاط' کے جواب میں ایک رسالہ لکھا جو 'تردید' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شوق نیموی نے 'تردید' کے جواب میں 'سرمۂ تحقیق' نام کا رسالہ لکھا جس میں جلال لکھنوی کی خوب خبر لی۔ شوق نیموی لکھنؤ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد نیمی واپس آ گئے۔ نیمی میں کچھ دنوں تک رہنے کے بعد پٹنہ آ گئے اور محلہ سلطان گنج میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ وہ اپنا وقت درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کی۔

شوق نیموی کی شادی 1882 میں ان کی خالہ زاد بہن مخدومن سے ہوئی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک ساتھ نہ نبھا سکیں۔ ان سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا عبدالرشید فوقانی پیدا ہوئے۔ شوق نیموی کی دوسری شادی چچازاد بہن سے ہوئی جو بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا عبدالسلام پیدا ہوا جو زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔

شوق نیموی کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جس میں 'ازاحۃ الاغلاط'، 'اصلاح'، 'سرمۂ تحقیق'، 'سوز و گداز'، 'نغمہ راز'، 'سیر بنگال'، 'یادگار وطن'، 'دیوان شوق' بے حد مقبول ہیں۔ مذہبی تصنیفات میں 'اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید'، 'جبل المتین'، 'ردالسکین'، 'جلاء العین فی رفع الیدین'، 'جامع الآثار فی صلوٰۃ الجمعۃ فی القری'، 'لامع الانوار فی نظر المختار'، 'مقالہ کاملہ'، 'الجلی فی ردقول المحلی'، 'تذئیل'، 'بتیان التحقیق'، 'آثار السنن'، 'روشحط الجید فی اثبات' وغیرہ۔ 'آثار السنن' نے انھیں زندہ جاوید کر دیا۔ شوق نیموی حدیث و فقہ کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ درج ذیل کتابیں ان کے ذوق کا نمونہ ہیں۔ دراصل اس میدان میں تحقیقی خدمات انجام دینے کا ان کے اندر

شعور پیدا کیا اور وہ ایک جید عالم اور محدث میں شمار ہونے لگے۔

شوق نیموی نے صرف چوالیس سال کی عمر پائی اور 25 نومبر 1904 کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

شوق نیموی خاموش طبعیت کے آدمی تھے اور بغیر کسی نام و نمود کے علم و ادب سے وابستہ رہے۔ ان کی تحریریں ملک ہی نہیں بیرون ملک میں بھی پڑھی جاتی ہیں اور کئی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

جہاں تک شوق نیموی کی شاعری کا تعلق ہے تو ان کا صرف ایک دیوان 'دیوان شوق' شائع ہوا جس میں غزلیں، رباعیات، قطعات، قصیدے شامل ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ شوق نیموی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ دیوان کافی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کا انتخاب اپنی سوانح 'یادگار وطن' میں خود کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے بہت ساری غزلیں ضائع کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ایک بڑا شاعر ان کے اندر موجود ہے۔ جس زمانے میں وہ شعر کہہ رہے تھے بہار میں شاد عظیم آبادی جیسے شاعر موجود تھے اور ان کی موجودگی میں اپنی شاعری کا لوہا منوانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن شوق نیموی نے شاعری کی اور خوب کی جس کا اعتراف پروفیسر وہاب اشرفی نے کیا ہے:

> ''شوق نیموی ایک غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں۔ دراصل ان کی ایک مثنوی 'سوز و گداز' اتنی مشہور ہوئی کہ ان کی غزلیں پس پشت چلی گئیں۔ نتیجے میں ان کی غزل گوئی کے امتیازات اب بھی پردہ فضا میں ہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کی 96 غزلیں جو حروف تہجی کے اعتبار سے ردیف وار مرتب ہیں صرف انھیں ہی نگاہ میں رکھا جائے تو بھی وہ ایک قابل لحاظ غزل گو ثابت ہوں گے۔ ان کا خاص مضمون 'وجود باری اور عشق الٰہی' ہے جسے ہم عام لفظوں میں تصوف کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر نیموی اس مسلک کے شاعر ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو، ص 417)

شوق نیموی با کمال شاعر تھے ان کا کمال فن ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد حالانکہ زیادہ نہیں پھر بھی ان کے مذاق سخن کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

شب فراق جو ہم آہ بھول کر کرتے
کلیجا تھام کے اُف اُف وہ رات بھر کرتے
گھڑیاں غم و حسرت کی شوق سر پر تھی
اُٹھانے والے جنازہ مرا اُٹھا نہ سکے

شوق نیموی کا عہد کلاسیکی شاعری کا عہد ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں کلاسیکیت بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔ غور طلب ہے کے اردو شاعری میں دو اسکول بے حد مقبول ہیں۔ دلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول۔ ان دونوں اسکولوں سے باہر رہنے والے شعرا کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس اسکول کی پیروی کریں۔ ان دونوں اسکولوں کا اردو شاعری پر اتنا گہرا اثر تھا کہ اس سے نکلنا مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر شعرا انھیں دو اسکولوں کے اردگرد اپنی شاعری کو رکھتے ہیں لیکن شوق نیموی نے دونوں اسکول سے فائدہ اُٹھایا اور اپنا ایک الگ رنگ گھولا۔ میری اس رائے سے ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن بھی اتفاق کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شوق نیموی کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دہلی شعری اسکول اور لکھنؤ شعری اسکول دونوں سے فیض حاصل کیا ہے کیونکہ ان کی شاعری میں دونوں اسکول کا رنگ تغزل صاف نظر آتا ہے اور یہی ان کا کمال فن ہے۔ انھوں نے جس چابکدستی اور مہارت کے ساتھ ان دونوں اسکول کے رنگ سے اپنے کلام کو سجایا ہے اور ہم آہنگ کیا ہے اس سے ان کی غزل گوئی کی قدر و قیمت کافی بڑھ جاتی ہے اور ایک الگ شناخت نظر آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ایک طرف صداقت، حقیقت بیانی، رنگینی، آمد، تاثیر اور سوز و گداز ملتا ہے جو دہلوی شعرا کا خاص رنگ ہے تو دوسری طرف رنگینیٔ حسن، دلکش ادائیں اور شوخیاں بھی ملتی ہیں جو شعرائے لکھنؤ کی خاص پہچان ہے۔ ان کے یہاں دوغزلہ، سہ غزلہ اور ابتذال کی روایت نہیں ملتی جو عام طور پر شعرائے لکھنؤ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کے غزلیہ اشعار کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شوق نیموی گرچہ مومن، میر، غالب، داغ، ذوق کے ہم پلّے نہیں ہیں تاہم ان کی غزلوں میں جو خوبیاں ہمیں نظر آتی ہیں ان کی بنا پر انھیں اس دور کے ممتاز

شعرا میں ضرور رکھا جا سکتا ہے۔" (مضمون 'بہار کی پر بہار شخصیت : علامہ شوق نیموی'، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، ص 70)

شوق نیموی واضح فکر و شعور رکھنے والے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری لفظوں کی بازی گری کا شکار نہیں ہوتی، نہ ان کے اشعار میں عروض و بلاغت کی پیچیدگیاں ہیں۔ وہ اپنی بات کو عام فہم زبان میں کہتے ہیں کہ انھوں نے شاعری کا خمیر بالکل اپنے آس پاس سے اُٹھایا اور اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی ذات اور کائنات کی حقیقت کو شعری آہنگ میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

میں نے جو دل بتوں سے لگایا خدا ملا
کہہ کر برا بھلا تجھے اے شیخ کیا ملا

لحد میں ایک طرح میں پڑا رہا تا حشر
کمال ضعف سے کروٹ بھی میں بدل نہ سکا

جو نغمہ زن ہے مری عندلیب فکر اے شوق
چمک گیا ہے گل گلشن سخن کا رنگ

شوق نیموی نے اپنی شرطوں پر زندگی گزاری۔ اگر وہ چاہتے تو نواب رام پور کلب علی خاں کے یہاں رہ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارتے لیکن ان کا ضمیر گوارہ نہیں کیا اور ملاقات کر کے وطن لوٹ آئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی وہ پٹنہ میں اپنی شرط پر ہی زندگی گزار دی۔ درس و تدریس سے جڑے رہے اور اُسے ہی ذریعہ معاش بنایا نیز تصنیف و تالیف میں سرگرداں رہے۔

مثنوی 'سوز و گداز' نے شوق نیموی کو بلند مقام عطا کیا۔ یہ مثنوی اس وقت منظر عام پر آئی جب مثنوی لکھنے کا رواج ختم ہو رہا تھا اور شعرا اس صنف سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ ایسے میں

شوق نیموی نے دو مثنویاں 'نغمۂ راز' اور 'سوز و گداز' لکھ کر اس صنف کو ایک بار پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ان مثنویوں نے شوق نیموی کو شہرت کی اس بلندی پر پہنچا دیا کہ جب بھی ان کا نام آتا ہے 'سوز و گداز' کا نام ضرور آتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'سوز و گداز' کی شہرت کی وجہ سے ہی ان کی دوسری تخلیقات پر اس طرح گفتگو نہیں ہوئی جس طرح ہونی چاہیے تھی۔ اس مثنوی کی اس وقت کے تمام بڑے شعرا نے تعریف کی اور اس زمانے کے اخبار و رسائل میں اس پر نہ صرف تبصرہ شائع ہوئے بلکہ اسے پڑھنے کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ 'ہزار داستان' نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جو صاحب خریداری میں تامل فرمائیں گے ہاتھ ملتے رہ جائیں گے، پھر کتاب ہاتھ نہ آئے گی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی بارہ سو جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں اور پبلشر کو اس مثنوی کو دوبارہ چھاپنا پڑا۔ اس مثنوی کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ بعض تالیفات میں اس کی بحر تک کی مثال دی گئی ہے۔

مثنوی 'سوز و گداز' کی تعریف داغ دہلوی سے لے کر فصاحت لکھنوی تک نے کی۔ اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ دو پیار کرنے والے کی کہانی اس ڈرامائی انداز میں پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ مثنوی کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ شوق نیموی نے پہلی بار ایک ایسی کہانی پیش کی جو حقیقت کے بالکل قریب نظر آتی ہے بلکہ کئی ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ پٹنہ میں ایسا واقع رونما ہو چکا تھا جسے شوق نیموی نے مثنوی کا روپ دیا۔ اس مثنوی کی دوسری سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مافوق الفطری کردار نہیں ہے۔ جتنے بھی کردار ہیں بالکل سامنے کے ہیں نیز تمام مناظر بالکل فطری ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ایسا واقعہ ضرور رونما ہوا ہوگا۔ مثنوی کے تمام کردار اپنے حقیقی روپ میں سامنے آتے ہیں اور اپنے نام کے مطابق اپنا کردار ادا کرتے ہیں کسی کردار میں تصنع نہیں ہے اور نہ ہی منظر کشی میں کہیں جھول ہے۔ سارے واقعات ایک کے بعد ایک رونما ہوتے رہتے ہیں اور پڑھنے والا آگے کے واقعہ کو جاننے کا متمنی ہوتا ہے۔ مثنوی 'سوز و گداز' پر اپنی رائے دیتے ہوئے پروفیسر مظفر اقبال لکھتے ہیں:

''مثنوی 'سوز و گداز' ایک کامیاب المیہ مثنوی کہی جا سکتی ہے۔ جناب شوق نے

مثنوی کے مختلف اجزائے ترکیبی کی تنظیم و ترتیب میں بے مثال فنکارانہ صلاحیت سے کام لیا ہے۔ پلاٹ سازی میں اپنی چابکدستی کا ثبوت پیش کیا ہے اور کردارنگاری کے بھی نہایت ہی عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ خصوصاً شام سندر کی سیرت کی پیش کش میں بہت ہی سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ مناظر کی تصویرکشی میں بھی شوق کامیاب نظر آتے ہیں۔ اسلوب بیان میں رنگینی و رعنائی ضرور ہے اور صنعتوں کا استعمال بھی دل کھول کر کیا گیا ہے لیکن شگفتگی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی مقام پر بھی انداز بیان میں بوجھل پن اور اغلاق نظر نہیں آتا۔ واقعات کے بیان میں بے جا طوالت سے پرہیز کیا گیا ہے اور مناسب ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔'' (مثنوی 'سوز و گداز'، مرتب پروفیسر مظفر اقبال، ص 37)

'یادگار وطن' میں شوق نیموی نے اپنے وطن نیمی اور وہاں کے لوگوں کے تذکرے اور علمی مباحث قلم بند کیے ہیں نیز اپنی زندگی کے حالات و واقعات اور اپنی کتابوں کو متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ شوق نیموی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس سوانح میں انھوں نے بالکل حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ نیمی کا جغرافیہ اور وہاں بسنے والے لوگوں کے حالات اپنی ابتدائی زندگی غازی پور، لکھنؤ اور پٹنہ میں قیام کے دوران گزاری ہوئی زندگی کو بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے نیز اپنی تصنیفات و تالیفات کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے اور اپنی کچھ غزلیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کتاب کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اور اختتام بھی حمدیہ نظم سے کرتے ہیں۔

نظم 'سحر ساز' میں قصائد، قطعات، رباعیات اور تقریباً سو غزلیں ہیں۔ 1893 میں علم و عروض و بلاغت کی مشہور کتاب 'حدائق البلاغت' مصنفہ میر شمس الدین فقیر مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی کے حواشی کے ساتھ شوق نیموی کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ چنانچہ بعض مقامات پر شوق نیموی کے حواشی اُن کے نام کے ساتھ مندرج ہیں۔

شوق نیموی نے جو مذہبی کتابیں لکھیں وہ بھی ادبی کتابوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ 'آثارالسنن' حنفیہ مسلک کی تائید میں احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب بے حد اہم کتاب ہے۔

'ازاحۃ الاغلاط' میں فارسی وعربی کے ان الفاظ کی تلاش وجستجو کی ہے جو اردوداں طبقہ اکثر غلط استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اسی کتاب میں تحقیق وزباندانی کے نئے راستے ہموار کیے ہیں۔ اس ضمن میں بعض جگہوں پر شوق نیموی نے ماہرین لغت سے بھی اختلاف کیا ہے۔ صفیر بلگرامی اس لیے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ بعد بہار عجم کے متعدد مثالوں کا ذخیرہ اس رسالے کے سوا کسی کتاب میں کم پایا جائے گا۔ یہ کتاب شوق نیموی نے زمانہ طالب علمی میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے جلال لکھنوی کی معروف کتاب 'تنقیح اللغات' کے بعض الفاظ کی تحقیقات سے اختلاف کرتے ہوئے شعری وادبی ثبوت پیش کیے تھے۔ جلال لکھنوی کو یہ ناگوار گزرا اور انھوں نے 'تردید' نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے شاگرد کے نام سے چھپوایا۔ شوق نیموی نے بھی اس کا جواب 'سرمۂ تحقیق' میں دیا جس میں جلال لکھنوی کی دوسری خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جلال لکھنوی نے ایک جعلی اشتہار فروری 1889 میں 'گلدستہ نغمہ بہار' میں شائع کروایا جس میں لکھا کہ شوق نیموی جو ایک قصبہ کا رہنے والا ہے وہ جلال لکھنوی جیسے عظیم شاعر کی غلطیوں کو منظر عام پر لانے لگا، یہ اس کی نادانی ہے اور اپنی غلطیوں کے لیے معافی مانگتا ہے۔ اس اشتہار کے بعد جلال لکھنوی کو کئی لوگوں نے برا بھلا کہا اور شوق نیموی کی حمایت میں کئی مضامین لکھے گئے۔ اس طرح یہ ادبی معرکہ ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

شوق نیموی زبانداں کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ یہ ان کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے قواعد پر بھی بحث کی اور اساتذہ کی غلطیوں کو بھی نشان زد کیا۔ ان کی شاعری بھی ان کی زباندانی اور فنی نزاکتوں کا پتہ دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''غزل میں عشقیہ مضامین درد آمیز معانی، پاکیزہ خیالات میں سلجھی ہوئی ترکیبیں، نکھری ہوئی بندشیں، دلکش الفاظ، چلبلے جملے، مربوط مصرعے، بھڑکتے ہوئے شعر ہونے چاہئیں۔''

شوق نیموی نے متروکات الفاظ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح میر و میرزا نے ولی و حاتم کے اکثر مستعمل الفاظ ترک کر دیے جیسے اودھر باشباع داؤ بروزن دودھ ادھر سے ایسا بگانہ بحذف یا بجائے بیگانہ پیار د

پیاس با ظہار یا بروزن دیا؟ رو ہر اس تئیس کو کے معنی میں تنک ٹک ذرا کے معنی میں دوانہ بجائے دیوانہ۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ان میں سے اکثر الفاظ تو وجوباً متروک کر دیے اور بعض الفاظ ایسے ہیں کہ کسی نے کہیں کہیں استعمال بھی کیے ہیں۔ اس کے بعد ان کے تلامذے کا دور ہوا اور انھوں نے بھی کچھ لفظ ترک کیے جیسے بگولہ، کہ بعض شعرا اس کو متروک کر کے بولا استعمال کرتے تھے۔''

شوق نیموی کے اندر تلاش و جستجو کا جو خمیر موجود تھا وہ ان کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے۔ زبان ان کے نزدیک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کا استعمال صحیح نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے صحت الفاظ پر خاصہ زور دیا ہے۔

اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ شوق نیموی بحیثیت شاعر جتنے مقبول ہیں، زباندانی کے فن میں اور اصلاح و اغلاط کے باب میں بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔ شوق نیموی ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت کا نام ہے۔

○

کتابیات

(1)	ازاحتہ الاغلاط	شوق نیموی
(2)	اصلاح	شوق نیموی
(3)	سرمۂ تحقیق	شوق نیموی
(4)	ایضاح	شوق نیموی
(5)	دیوان شوق	شوق نیموی
(6)	سوز و گداز	شوق نیموی
(7)	یادگار وطن	شوق نیموی
(8)	سیر بنگال	شوق نیموی
(9)	نغمۂ راز	شوق لکھنوی

مذہبی تصنیفات

(1)	اوشحتہ الجید فی اثبات التقلید	(اردو)	شوق نیموی
(2)	جبل المتین	(اردو)	شوق نیموی
(3)	ردالسکین	(اردو)	شوق نیموی
(4)	جلاء العین فی رفع الیدین	(اردو)	شوق نیموی
(5)	جامع الآثار فی صلوٰۃ الجمعۃ فی القری	(اردو)	شوق نیموی
(6)	لامع الانوار فی نظر المختار	(اردو)	شوق نیموی
(7)	مقالہ کاملہ	(اردو)	شوق نیموی

(8) الجلی فی ردقول المحلی (اردو) شوق نیموی
(9) تذئیل (اردو) شوق نیموی
(10) بتیان التحقیق (عربی) شوق نیموی
(11) آثارالسنن (عربی) شوق نیموی

دیگر کتابیں

(1) شوق نیموی حیات وخدمات ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان
(2) شوق نیموی ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
(3) علامہ شوق نیموی حیات اورلسانی خدمات ڈاکٹر عبداللہ خاں
(4) مثنوی سوز وگداز (مرتب) ڈاکٹر مظفر اقبال

رسائل

(1) اردودنیا دسمبر 2017
(2) بھاشاسنگم اکتوبر 2017 تامارچ 2018
(3) بصیرت اگست 2019

○

علامہ شوق نیموی (1860-1904) کا شمار اردو کے صاحب اسلوب شاعر، محقق اور دبستان عظیم آباد کے معتبر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ فقہ اور دیگر دینی علوم و مسائل پر انھیں جو درک حاصل تھا اس کا ثبوت ان کی کتابوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ ایک گراں قدر محقق و زبان داں اور محدث بھی تھے۔ شوق نیموی کی تحقیق وتنقید اعلیٰ درجہ کی ہے نیز شعر وسخن کا عمدہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کو عربی، فارسی اور اردو پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے 44 سال کی عمر پائی۔ ان کی کم و بیش پچیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں 'ازاحۃ الاغلاط'، 'اصلاح'، 'سرمہ تحقیق'، 'دیوان شوق'، 'نغمہ راز'، 'سوز و گداز'، 'یادگار وطن'، 'سیر بنگال'، 'آثار السنن'، 'تذئیل'، 'مقالہ کاملہ'، 'جبل المتین'، 'جامع الآثار'، 'اوشحۃ الجید فی ثبات التقلید'، 'ردالسکین'، 'لامع الانوار فی نظر المختار' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

زیرنظر مونوگراف کے مصنف اردو کے مشہور فکشن نگار احمد صغیر (پیدائش 1963) ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ'، 'انا کو آنے دو'، 'داغ داغ زندگی'، 'درمیاں کوئی تو ہے'، 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی' (افسانوی مجموعے)، 'جنگ جاری ہے'، 'دروازہ ابھی بند ہے'، 'ایک بوند اجالا'، 'آسماں سے آگے' (ناول) قابل ذکر ہیں۔ انھیں دہلی اردو اکادمی، اترپردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے اپنے انعامات سے نوازا ہے۔

ISBN 978-93-5548-299-0
₹ 50

Shauq Neemvi
(Urdu)

ساہتیہ اکادمی